نظم آزاد

جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

از

شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

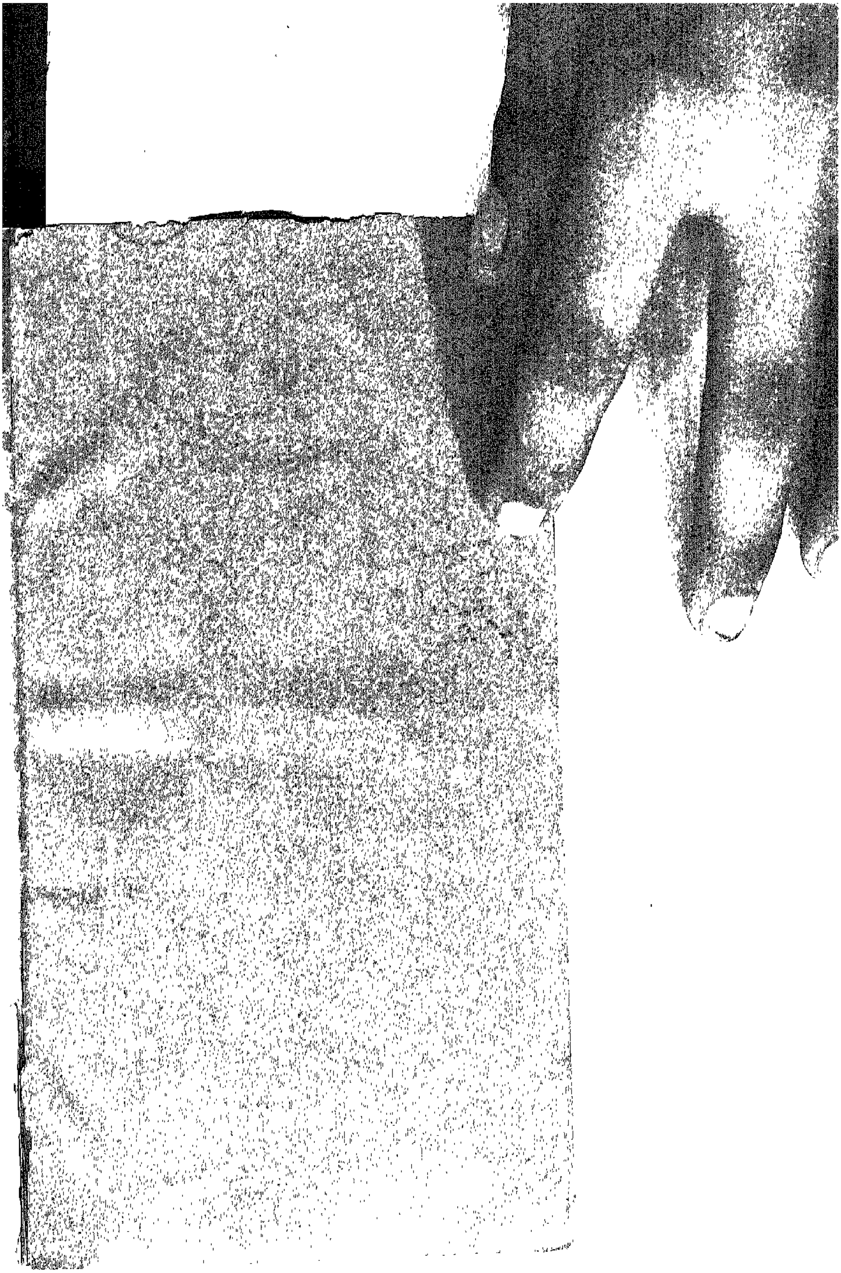
حسب فرمایش

آغا محمد طاہر نبیرہ حضرت آزاد

در مطبع کریمی لاہور طبع شد

۱۹۲۶ء

بار سوم — قیمت [illegible]



نظم آزاد

جو حسن وعشق کی قید سے آزاد ہے

از

شمس العلما مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم
سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

حسب فرمایش

آغا محمد طاہر نبیرہ حضرت آزاد

در مطبع کریمی لاہور طبع شد

۱۹۲۶ء

بار سوم

قیمت ۸ر

(۴۸۹۱)

دیباچہ

یہ راز سب پر ظاہر ہے کہ ہماری زبان جس کو اُردو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا پھل ہے۔ یہ نئی ایجاد ضرورت کے گھر میں پیدا ہوئی۔ روز مرہ کاروبار کی ماں نے پیٹ میں رکھا۔ لشکر کے بازاروں میں بچپن گذرا۔ لڑکپن تھا کہ کھیل کود نے شاہجہان بادشاہ کے قلعہ میں پہنچا دیا۔

یہ ہونہار بچہ ایسی باتیں بناتا تھا کہ دیسی پردیسی سب کے دلوں کو بھاتا تھا۔ اور اپنے ننھے ننھے جملوں سے ہر امیر غریب کا مطلب ادا کرتا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو بازارِ حُسن میں ترچھی نگاہیں لڑانے لگا۔ شعرا کہ ازل سے تیر عشق کے زخم خوردہ تھے۔ ان کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ جھٹ گود میں اُٹھا لیا اور اپنے دل کی باتیں گل و بلبل کے افسانے اسی کے منہ سے کہلوانے لگے۔

شہنشاہ ہند محمد شاہ جنکی عشق بازی و ہوسناکی قیامت تک عبرت کا مرقع رہیگی ان کو اس کی نازک ادائی ہزار جان سے پسند آئی اور اس کو اپنی مصاحبت خاص کا درجہ عنایت فرمایا۔

یہ لڑکا اسی گلریزو عنبر بیز صحبتوں میں جوان اور جوان سے نوجوان ہوا۔ مگر وہاں کی آب و ہوا کچھ موافق نہ پڑی۔ بلکہ ہر وقت کی رنگ رلیوں نے مزاج میں کچھ ایسی

وارفتگی پیدا کردی تھی کہ ہر وقت گل و بلبل۔ جام و مے، حُسن و عشق۔ ہجر و وصال کے گیت گانے لگا۔ اور اگر کوئی شخص اُسے ان دلبستگیوں سے علیحدہ کرتا تو حسرت و یاس، غم و الم، سوز و غم کی ایسی دردناک تانیں لگاتا کہ سُننے والوں کے رہے سہے حوصلے پست ہو جاتے اور دل ڈھئے جاتے۔ مجبوراً پھر اس کو گلزار میں لیجا کر چھوڑ دیتے +

خدا کی قدرت دیکھئے کہ دانایان فرنگ جو سوداگری کے لباس میں سلطنت کا بازار لگانے آئے تھے اُن کو ایک ترجمان کی ضرورت پڑی۔ اُنھوں نے ہر چند نگاہ دوربین کو انتخاب کے میدانوں میں دوڑایا مگر ان کو سوائے اس آشفتہ مزاج نوجوان کے اور کوئی اس کا اہل نظر نہ آیا +

بصد مشکل اُنھوں نے اس لڑکے کو منایا۔ کچھ لالچ دیا۔ کچھ وعدے کئے۔ اور اس عاشق مزاج کو قابو میں لائے۔ اوّل اس کو کلکتہ میں رکھا۔ سوداگری کے بازار میں لین دین پر لگایا۔ پھر دفتروں میں لئے لئے پھرے۔ مگر اس کی حالت یہ تھی کہ جب کہیں چار ہم مشرب نظر آ جاتے اور موقعہ پاتے۔ جھٹ اپنا پرانا رنگ جما بیٹھتے اور وہی آشفتہ مزاجیاں اور وارفتگیاں سب کی آنکھوں میں پھر جاتیں +

اب اس نوجوان نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ گذر اوقات کے لئے تو انگریزوں کے دفتروں میں دن گذارتا۔ اور لطف و کیف کے لئے دہلی کے بازاروں امیروں کے دیوان خانوں اور مغلوں کے درباروں میں راتیں صرف کرتا۔ ابھی یہ قصہ یہیں تک آیا تھا کہ زمانے نے ایک ورق اور اُلٹا۔ مغلوں نے سلطنت کا کوہ نور ہیرا

اپنی بے اعتدالیوں کے باعث انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا +

پھر کیا تھا بدامنی کی آندھیاں آئیں۔ آشوب کے مینہ برسے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں بنے بنائے لاکھ کے گھر خاک ہو گئے اور وہ عشرت کدے درسِ عبرت دینے لگے۔ اور ہندوستان میں کسی کو سر چھپانے کا ہوش نہ رہا۔ مگر اس نوجوان کو انگریزوں نے دفتروں میں اور شرفا نے گھروں میں پناہ دی۔ جب امن و امان کا حکم عام ہوا تو پھر اُردو کا شہ زور جوان دلبستگیاں ڈھونڈنے لگا۔ مگر اب سوائے حسرت و یاس کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ یاس ہی کے مرثیے پڑھنے لگا۔ اور ایسے انداز سے درد انگیز قصے سناتا کہ بھلے چنگے دل بیٹھ جاتے اور کام پر دل نہ لگتا تھا۔ غرضکہ اُردو وبالِ جان ہو گیا +

یہ زمانہ ہندوستانیوں کے لئے عجب زمانہ تھا۔ اب یہ حاکم نہ تھے۔ بلکہ محکوم۔ اور محکوم بھی ایسی قوم کے جو ظاہر میں ہم جیسے آدمی مگر حقیقت میں کام کرنے کی مشین تھے۔ جنہوں نے علم و فلسفہ۔ سائنس و حکمت کو اپنا دوست نہیں بلکہ غلام بنا لیا تھا۔ ایسی حالت میں وہی افراد ان کا ساتھ دے سکتے تھے جو اُن جیسی ہمت اور ولولے رکھتے ہوں ورنہ دو قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ مگر یہ ولولے فرداً فرداً پیدا ہونے ناممکن تھے۔ یہ قومی جوش و خروش کے محتاج ہیں۔ اور جبتک قوم کو نہ جگایا جائے۔ یہ نعمت محال ہے +

اب دشواری اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ہندوستان کو کون جگائے اور جگائے تو کس زبان میں قومی ترانہ بلند کرے کہ خدا نے اسی اُجڑے دیار جس کو دلی کہتے ہیں وہاں کے ایک خاندان برباد

مردِ خدا کو پنجاب میں ہماری زبان کا مجدد بنا کر بھیج دیا۔

اس نے وہ عشرتکدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ زبان مذکور کی عہد بعہد کی ترقیاں اس کے سامنے پرورش پا چکی تھیں۔ اس انقلاب سے پہلے بھی وہ اور اُس کا خاندان اُردو کی خدمت کو ملک کیلئے واجب جانتا تھا۔ اس کے والدین نے اس کا نام محمد حسین رکھا تھا اور اُردو کے پیغمبر حضرت ذوقؔ نے آزادؔ کا معزز تخلص عنایت فرما کر اسکو زبان مذکور کا مجدد بنایا تھا۔

حضرت آزاد نے پہلے تو اُردو نثر کی داغ بیل ڈالی اور اس میں ایسی راہ نکالی کہ سبحان اللہ پھر اس پر ایسی عبارت آرائی کی کہ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ مگر قوم کو جگانے اور اُٹھانے کے لئے نثر کا کھیل کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں نظم کے جادو کی ضرورت تھی۔ تو اس جادو کارنے اسی اُردو کے شہ زور جوان کو للکارا۔ وہ اس دولت سے خالی تھا۔ اُس کے خزانے پر حسن و عشق کا خزانچی قبضہ کئے بیٹھا تھا۔ مگر مولانا نے ہمت کے پر لگائے۔ یورپ کی زندہ قوموں کے افسانے مانگے تاریخ کے پھول اسمیں سجائے حسن و عشق کے خزانچی سے الفاظ لئے اور نظم اُردو میں اسی جگمگاتے مینار کی بنیاد رکھی۔

سنہ ۱۸۷۴ء تھا کہ نظم اُردو میں انقلاب آیا۔ لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی اور اس میں یہ گلدستہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ کچھ ہم خیال احباب نے اس کو سنبھالا۔ کچھ حکام وقت نے اس کی نگہداشت کی اور یہ بڑھنے لگا۔ ابھی پودا ابھی نہ بننے پایا تھا کہ پرانے دقیانوسی حسن و عشق سے از کار رفتہ گل و بلبل کے مرثیے ہاتھوں میں سنبھال اس کی مخالفت کے لئے نکل کھڑے ہوئے اس خیال کے سادہ لوح بزرگ جہاں جہاں تھے۔ تڑپ گئے اور متفق ہو کر اس نوخیز پودے

لتاڑنے کے درپے ہوگئے +

اب کیا تھا ہر طرف سے ملامت کے تیر آنے لگے کہ ہائے ہائے یہ شخص پرانی شاعری کو خاک میں ملائے دیتا ہے اور ہمارے بزرگوں نے جو جو سلطنتیں اور حکومتیں کھوکر حاصل کی تھی اسکو یوں برباد کرتا ہے۔ افسوس اُن حضرات کی آنکھوں پر قدامت کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور لکیر کے فقیر ہوکر گھر بیٹھے کمبل میں مست ہو رہے تھے۔ کاش وہ ذرا غور سے اس گلکاری کو دیکھتے تو انہیں اسمیں میر کا درد سودا کا زور کلام۔ آتش کی آتش بیانی۔ ذوق کی سادگی اور محاورہ بندی میر حسن کی روانی سب کچھ نظر آجاتا۔ مگر ہاں اتنا فرق ضرور تھا کہ ان بزرگوں نے فقط زبان مذکور کی پرورش کی اور اپنی دل لگی اور دلبستگی کا سامان فراہم کیا۔ اور حضرت آزاد نے اسی سرمایہ سے نظم اُردو کا نیا سینا بنایا اسمیں قومی جوش وخروش اور ہمت کے ولولوں کا چراغ روشن کیا کہ اسکی روشنی اور چاندنی میں بستی کے رہنے والوں اور قوموں کی کوششیں اور ہمتیں صاف آئینہ ہو جائیں اور انہیں بھی اپنے لئے اخلاق حسنہ اور قوم کیلئے بہبودی کا سرمایہ جمع کرنیکی اُمنگ پیدا ہو +

اس دن کون کہہ سکتا تھا کہ وہ پودا ایکدن اسقدر گھندار درخت بن جائیگا اور وہی تیر ملامت اسکی شاخیں اور پھل پتے بنکر قومی ترانے گائینگے۔ اور انہیں ملامت کرنے والوں کی اولادکو اسکی روشنی سے فیض پہنچیگا۔ آج ڈاکٹر اقبال۔ ظفر علی خاں وغیرہ اور ہزاروں قومی درد رکھنے والے شاعر پیدا ہو جائینگے +

یہ نظم اُردو میں اسقدر عظیم الشان کارنامہ ہے جو قیامت تک سونے کے حرفوں سے لکھا جائیگا۔ اور یاد رہیگا۔ اور جبتک نظم آزاد باقی ہے۔ یہ قوم کے بچوں کے دلوں کو گرمائیگی۔ اس کی ہر نظم ایک کتاب ہے۔ ایک سبق ہے۔ ایک رستہ ہے بلکہ ایک دیا ہے جو سب چلنے والوں کو راستہ دکھا رہا ہے۔ بعض جگہ بحر کی مجبوری اور زبان کی کم مائگی کیوجہ سے آج ہمکو کچھ الفاظ بوجھل بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دوستو خیال تو کرو کہ ہمارے مصور کا یہ نقش نقش اول تھا یا انہیں کا ستا تھا۔ اس پر غور نہ کرو۔ بلکہ اس درخت سے پھل کھاؤ اور اسکی گٹھلیوں سے اور پودے لگاؤ۔ آج دنیا بھر کے

وسائل تمہاری خدمت کو ہاتھ باندھے حاضر ہیں۔ اُن سے مدد لو۔ پیوند کرو۔ اور دیکھو کیا سے کیا ہوتا ہے +

یہ نظمیں یا مثنویاں سنہ ۱۸۹۷ء میں والد مرحوم نے دردمند احباب کی فرمائش سے جمع کیں اور چھپوائیں اس وقت قوم کو اس طرف بہت کم خیال تھا۔ ایک عرصہ دراز میں وہ ختم ہوئیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا کے انتقال کے بعد ملکی ضرورتوں نے اہل ملک کو قومی اصلاح کی طرف زیادہ متوجہ کر دیا تھا۔ والد مرحوم نے دوبارہ چھپوائی۔ اور اسمیں غزلیات، قصائد، متفرق اشعار جو مل سکے شامل کر دیئے یہ کثیر التعداد ایڈیشن بہت مرغوب اور مطلوب ہوا۔ اب تیسرے ایڈیشن کے چھپوانیکا فخر قدرت نے میرے نام پر لکھ دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس عزت سے سرفراز ہوتا ہوں۔ میں نے نظم آزاد علیحدہ کر دی ہے کیونکہ "حسن و عشق کی قید سے آزاد" کا خوبصورت جملہ اس کے زیب سرورق ہے۔ دوسرے اب تمام ہندوستان میں یہ کتاب نوجوان طالب علموں کے ہاتھوں میں اور ہاتھوں سے کانوں اور آنکھوں کے راستے دلوں میں اترتی ہے۔ لہذا میں نے غزلیات وغیرہ علیحدہ دوسرے حصہ کے لئے رکھ لی ہیں۔ انشاء اللہ زندہ رہا تو اور غیر مطبوعہ غزلیات، قصائد، مرثیے، سلام، رباعیات شامل کر کے اسکو چھپوا دونگا۔ اس دفعہ اسکا سائز بھی بدل دیا ہے۔ اس میں بھی طالب علموں کی سہولت مدنظر ہے +

اب خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھ ناچیز عبد ذلیل کے اہتمام اور سعی سے چھپی ہوئی نظم آزاد کو قبولیت کا خلعت عنایت فرما اور جو مقصد کہ مولانا ممدوح کا تھا اُسے پورا کرے۔ کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اپنے پیارے ملک کا جاں نثار اور سچا وفادار بنا اور شرافت حقیقی کے وہ جوہر عطا فرما جو ہمارے بزرگوں کے لئے طغرائے امتیاز تھے اور ہم کو مخلص اور ایثار مجسم بنا دے۔ آمین یا رب العالمین +

دعا کا محتاج طاہر نبیرۂ آزاد

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء

استقبال کردے۔ دُور کو نزدیک کردے۔ زمین کو آسمان کردے۔ کس راندہ کو اُجالا کردے۔ اگر غور کرکے دیکھو۔ تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیے کہ دیا آنچ چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو پلہ شاہین میں ہے۔ ترازو اُس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے جھکا دے۔

نظم درحقیقت ایک شاخ گل ریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بُو سے مختلف خوشبوئیاں محسوس دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بُو تیز ہے۔ کسی کی بُو مست ہے۔ کسی کی بُو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے۔ جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں ہیں کبھی ہار میں۔ کبھی عطر کھینچکر۔ کبھی عرق میں جاکر کبھی دُور سے کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔

عالم جسمانی میں انسان کے لئے غذا مادہ حیات ہے۔ اسی طرح عالم معنی میں رُوح کے لئے غذا درکار ہے چونکہ اشعار و مضامین لطیف سے رُوح قوت کمال اور طاقت بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اُس کی غذا ہے۔ رُوح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے کہ وہ خاص روح القدس کے آفتاب قدرت کا پرتو ہے۔ اسی سے شعر کے جوہر لطافت کو خیال کرنا چاہیئے کہ نفاست میں کس مرتبۂ عالی پر ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبت خاص عالم بالا سے ہے کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے اُدھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی کا ہے۔ کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہرا

ان میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح پر حکومت کرتا ہے
وسائل تہاری جو ی صاحب خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں
یہ نظیر سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔
جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے۔ اور یہ تصرف مالکانہ
اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اس کی جسے ایسے ملک معنی کی
سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی
خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتو ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا
جوہر۔ تاثیر معنوی کا ست ہے۔ روح کیلئے آب حیات ہے۔ گرد غم کو دل سے
دھوتا ہے۔ طبیعت کو پھیلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور
بے نیازی۔ ذہن کو قوت پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامن دل کو بلند رکھتا
ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت
سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردد میں غرق
رہتا ہے لیکن ایک شعر کہہ کر جیسی اس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے
بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں
ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے۔ کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت
حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لطف طاقت تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔
اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے۔ صاحب درد ہی اُسے خوب جانتا
ہے۔ کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ
فضیلت اختیاری نہیں یعنی موزونیِ طبع جوہر خداداد ہے۔ اور اس نعمت کو
خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

رُباعی

سر حلقۂ عشق بوالہوس را ندہند   سوز دل پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار   ایں دولت سرمد ہمہ کس راندہند

جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اُسی متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے [illegible]ی اُس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے معشوق کے سوا کسی سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت نصیب کرے ÷

اکثر لوگ ایسے ہیں۔ کہ جسمانی محنت سے مرکھپ کر انہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطفِ شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں ایک مصرع پُر درد اُن کی زبان سے نہ نکلے اُن کا ذکر بھی انشاءاللہ اس سلسلے میں آئے گا ÷

بعضے ایسے ہیں۔ کہ اُن سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انہیں موزوں و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضب الٰہی ہے۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں۔ مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں۔ کہ زبان اُن کی صاف ہے۔ مگر مضامین عالی نہیں چنانچہ ہر ایک کی جگہ پہ بجائے خود اشارہ کیا جائیگا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ جوش مضامین اور شگفتگئ طبع کے لئے بعض بعض موسم خاص ہیں چنانچہ فصل بہار اور موسم برسات میں طباعِ موزوں [illegible] ہیں شگفتہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ناموزوں اور مُردہ دلوں کی طبیعت [illegible] کام میں لائے حرکت مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے [illegible] ہو کر گمراہی [illegible]

اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اول خلوت۔ کہ جہاں ذہن اور طبیعت منتشر نہ ہو۔ خواہ گھر میں گوشۂ عافیت ہو۔ خواہ باغ خواہ صحرا خواہ کنارِ دریا۔ اور دل ہمہ تن اُسی میں مصروف ہو +

اکثر وقتِ شب جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سنسان ہوتا ہے۔ تب اُس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے۔ اور مضمون پیدا ہوتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف اور ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذت حاصل ہوتی ہے مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظ پُرمعانی زبان سے تراوش ہوتے ہیں +

شاعر کو چاہیئے۔ کہ طبیعت اُس کی زیادہ تر قابل اور متاثر ہو۔ مثل آبِ رواں کہ جو رنگ اُس میں پڑ جاتا ہے وہی اُس کا رنگ ہو جاتا ہے اور جس چیز پر پڑے ویسا ہی رنگ دیتا ہے مائل کی رباعی اس مقام پر مجھے یاد آئی ہے

کعبہ میں بھی ہم نے اُسے جاتے دیکھا اور دَیر میں ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے یہ ہفتاد و دو ملت مائل ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

اُس کی ایسی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت۔ یا غم۔ رزم یا بزم کا باندھتا ہے جتنی اُس کی طبیعت اُس سے متاثر ہوتی ہے اُتنا ہی اثر سننے والے کے دل پر ہوتا ہے۔ دنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں۔ کہ جب وہ شعر سنتے ہیں تو اپنے ہاتھ بیقرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ طبیعت عشق یا ہوس صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ

کہ اُن کے سامنے اگر طلسمات معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کرکے رکھ دو تو بھی اُنہیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورت دل ہے کہ نورِ معنی اُس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشندلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ نوبہار قدرت الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے ÷

علم موسیقی کا لطف اور گلزار بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بیچارے اُن کے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے - اسی طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائی دل سے محروم ہیں وہ کیفیت شعر و فصاحت کلام سے محروم ہیں - اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں - تو بے شک شعر بالکل کار بے فائدہ ہے - اور اس میں شک نہیں کہ اپنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبع موزوں رکھتے ہیں اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ و کسبِ دنیا وی بھی خاطر خواہ دیوے - اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ سرِ معنی اور اصل سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صناع خبث طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا۔ شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار

کی۔ پس اس کے لئے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔ مسائل فلسفہ و حکمت جن سے اہل ہدایت ثبوت ذاتِ باری اور تصدیق وحدت الٰہی کرتے ہیں اُسی سے اہلِ ضلالت دہر و الحاد پہ استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے اُن کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آسکتا۔ اُسی طرح شاعروں کی بدزبانی و بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مُراد ہے جو جوش و خروش خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسے قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں +

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور اُن تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے البتہ فصاحت اور بلاغت اب زیادہ ہے۔ مگر خیالات خراب ہوگئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے اُنھوں نے جن جن چیزوں کی قدردانی کی لوگ اُس میں ترقی کرتے گئے ورنہ اسی نظم شعر میں شعرائے اہل کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن کی بنا فقط پند و اندرز پر ہے۔ اور ان سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و حکیم سنائیؒ و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی۔ فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے کو آج نہیں۔ مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔ آزاد

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا   نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

تقریر جلسۂ منعقدہ ۱۵۔ اگست سنہ ۱۸۶۷ء   بندۂ آزاد محمد حسین

مضمونِ لکچر

اے حاضرین باتمکین! آج میں ایک ایسے امر پر گفتگو کرنے کو حاضر ہوا ہوں جس میں دخل دینا میری حد سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں اُس ملک وسیع کی زبان سے متعلق ہے جسے اہل عالم مملکت ہندوستان کہتے ہیں۔ اُس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حبّ الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی۔ امر مذکور کیا ہے؟ نظم اور انشا پردازی اردو زبان کی ہے۔ جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب اور عام تصنیفات اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کر کے پرانی بنیادیں نکالی جائیں۔ اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے جس میں فارسی کے مسافر نے آکر عمل دخل کیا۔ اور صاحب خانہ نے اُس بن بُلائے مہمان کو اپنے وسعت اخلاق سے اُس کے خاطر خواہ جگہ دے دی ٭

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے عہد میں عام زبان تھی مگر دربار اور علموں پر ماں کا قبضہ تھا۔ یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بلاغت کے دریا لوٹتے تھے۔ اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گھروں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی۔ اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اس اعلےٰ درجہ پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں ہیں پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں [1]

[1] اس عبارت کے بعد ایک سطر اگلا ورق ـــ

اردو کے مالک اُن لوگوں کی اولاد تھے جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے۔ اسی واسطے اُنہوں نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دل چسپ اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پردازی کا فوٹوگراف فارسی سے اردو میں اُتار لیا تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے۔ اُنہیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چنبا چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔ ہزار، بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ اُن کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم اور اسفندیار کی بہادری۔ کوہ الوند اور بے ستون کی کی بلندی جیحون سیحون کی روانی نے یہ طوفان اُٹھایا۔ کہ ارجن کی بہادری۔ ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا ٭

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ کہ اُس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہو گیا۔ اُس کے استعاروں اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں۔ جہاں کے چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لئے انہیں پھولوں کا عطر اس زبان میں آیا۔ بے شک اُنکی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجہ پر ہے۔ اُس کی حد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو۔ تو باریکی اور تاریکی الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے۔ کہ کبھی چمکا اور کبھی نہ آئے ٭

اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے۔ کہ مبالغے اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم کسی شئے پر رغبت یا اس سے نفرت۔ کسی شئے سے خوف یا خطر۔ یا کسی پر قہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو۔ اس کے بیان سے وہی اثر وہی جذبہ۔ وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بے شک مبالغے کا زور۔ تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقعہ پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار صلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولینگے تو دیکھینگے۔ کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار۔ طرّے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے ❖

۱۴ اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں اُس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پُرانے ہو گئے۔ اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے لباس کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو۔ تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے۔ اور تمہیں درد نہیں آتا۔ اپنے خزانہ اور نئے توشہ خانہ سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ یہ وطن کا قرض ہے کہ قرض سے زیادہ اُس کا ادا کرنا واجب ہے +

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا۔ اور اُس سے نظم اور انشائے اردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ اُن لوگوں کی بدولت ہوئی کہ بھاشا اور فارسی دونوں سے واقف تھے۔ تم خیال کرو جو اُس وقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا۔ آج بعینہٖ اردو و انگریزی کا حال ہے۔ پس اُس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتو حاصل ہوگا۔ تو اُنہی لوگوں کی بدولت ہوگا جو دونوں زبانوں سے واقف ہوں گے۔ اور سمجھیں گے۔ کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں۔ جو اردو کے لئے زیور زیبائش ہو سکتے ہیں تا

اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش وخروش۔ اور لطائف وصنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اِس قدر دے گئے ہیں۔ کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھِر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف۔ بہت سے حسرت و ارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزان۔ فلک کی شکایت اور اقبالمندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں +

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے۔ بے جگہ لٹاتے ہیں کیسی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہر قسم کے مطالب ومضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا؟ سُن کر ترسیں۔ اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں۔ اتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے جس کے اعلےٰ درجے کے نمونے

انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ردیف
وقافیہ کے ساتھ ایسی دل پسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان
ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔
اے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں جب مجھے
نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ
رہیگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بسبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا
نہ ہونگے۔ کئی پرانی مورتیں باقی ہیں۔ وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان
ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی۔ اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا
میرے اہل وطن! آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔
اٹھو۔ اٹھو۔ وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری
شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔
اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد
ایسا پائیگی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی۔ اور
اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ سردست یہ کام کچھ مشکل ہے۔ کیونکہ ان محدود
احاطوں میں جو کچھ موجود ہے وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے
سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کرکے پیدا کیا ہے۔ دلوں
کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کرکے بہائے ہیں جب یہ دل پسند
خیالات، شستہ الفاظ، پاکیزہ ترکیبیں، خوش نما تراشیں، مضمون کی گرمیاں،
انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں کہ سننے والوں کے کانوں میں رس ٹپکاتی ہیں۔
اگر کوئی موزوں طبع چاہے کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں سے

مثنوی موسوم بہ شبِ قدر

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو ‏ — ‏ عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے ‏ — ‏ پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے ‏ — ‏ اور ڈالی آسیہ شام نے غربت کی گرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے ‏ — ‏ اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں ‏ — ‏ اور روشنی تھی عام زمین آسمان میں
جو کچھ کہ تھے سفید و سیہ آشکار تھے ‏ — ‏ جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے
دولابِ چرخ پر مگر اپنا مدار ہے ‏ — ‏ چلتا اسی پہ دورِ خزان و بہار ہے
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے ‏ — ‏ اور رات کو بنایا ہے آرام کے لئے

رخصت ہو تو کہ آتی شبِ مشک ریز ہے
پھر صبح اٹھ کے چلنا گریز اگر یز ہے

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو ‏ — ‏ عالم میں شاہزادیٔ مشکیں نسب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیبِ رقم کروں ‏ — ‏ پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں ✗
ہونا وہ بعدِ شام شفق میں عیاں ترا ‏ — ‏ اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں ‏ — ‏ لہرانا پرنیان و حریرِ سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پہ ‏ — ‏ فرماں نشان میں یہ اڑے گا جہان پہ

تا صبح ہووے کارگہِ روزگار بند

آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے — ہر گوہر اس میں ملکِ حبش کا خراج ہے
لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں — ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں
اس رنگ پر دکھا رہی کیا آب و تاب ہے
تیرا چمکتا چہرہ سیاہ آفتاب ہے

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی — ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم — کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں — اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے — شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے
سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے — اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر — ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے — دامان دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پر اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چوکا ہے بلکہ راہزنِ نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے — عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں — سب آ گئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں
جس کو پکارو وہ سوئے خوابِ عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر — بیٹھا تھا جس کا سکہ زمیں آسمان پر

کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق و برق سے رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جا بجا تھے جو دکھ درد پا رہے اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے
بارِ گراں غریبوں نے سر پر اُٹھائے ہیں جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں
اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت آوارہ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت
آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اُتار کر
اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اس وقت اُن بچاروں نے آرام پایا ہے

اِس دم امیر زادے کئی بے نظیر ہیں مسند کے آسمان پہ بدرِ مُنیر ہیں
دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اور ہے پردہ میں شب کے بادۂ گلگوں کا دور ہے
اک گلعذار سامنے سرگرمِ ناز ہے اور جام دے رہی نگہِ نیم باز ہے
کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر بیٹھے ہیں نعمت کے ناز میں پر دل کو اُن کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں
سامانِ عیش سب ہیں مہیا کئے ہوئے جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے
مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں — آرام سے نہ دیتے ہوئے ساماں بہت سے ہیں
دن ہووے یا ہو رات انہیں کام کچھ نہیں — اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹینگے رات کو

اور اُن کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے — دن بھر اٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے
تھا صبحدم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو — وہ حق حلال کر کے گھر آیا ہے شام
اب اپنی نان خشک کو پانی میں چور کر — کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور

سر پر قیامت آئے تو اُس کو خبر نہیں
سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے — وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا
بندے خدا کے ایسے یہاں بے شمار ہیں — دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں
کیجے ذرا خیال کہ ملا سے نکتہ داں — بیٹھا ہے سر جھکائے جلائے چراغ
کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی — مضموں جو ہمدگر ہیں اُلجھتے کبھی کبھی
ہر لفظ کو پہناتا ہے معنی نئے نئے — دکھلاتا زورِ طبع ہے یعنی نئے نئے
لیکن کبھی مقاصد اصلی سے چھوٹ کے — کرتا ہے آپ ردّ و قدح جھوٹ موٹ

بیٹھا حرام کر کے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں — کل صبح امتحاں ہے سو اسکے خیال میں
رل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے — پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے — کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے

قسمت تو ہر طرح سے ہے پہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں — آدھی بچی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیئے ہوئے — بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیئے ہوئے
ہے سہارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی

اور دیکھنا نجومئ دانا کی شان کو — ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو
اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر — ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
کٹتی ہے اسکی تارے ہی گن گن کر تمام رات — پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات
پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں — نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں
اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں — دزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں ہے — اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک این وآں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر — ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئیگا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائیگا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے — بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے — اڑتا گر ہے کھوئے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر — جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے — ہو جاتے ہیں وہیں در مضموں نئے نئے
مضمون تازہ گر کوئی اس آن رل گیا

یوں خوش ہے جیسے نقشِ سلیماں مِل گیا

اِس تیرہ شب کے پردے میں شاعر جو چور ہے   پھرتا ٹٹولتا ہوا مانندِ کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضموں غزل سے ہے   لاتا پر اپنے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے
تعریفیں اُس کی کرتے ہیں جو شعر سُنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں   آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ امّیدوار ہے   اور کرتا صدقِ دل سے دُعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض   رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تُو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں   کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کر جاتا صاف دشمن بد بیں پہ چوٹ ہے   اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے
کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تو نے سرِ شام آن کر   سجّادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
اور اُس پہ حق پرست جو یادِ خدا میں ہے   بیٹھا رہِ فنا پہ ہوا سے بقا میں ہے
اس کو اُسی کی ذات سے ہے لَو لگی ہوئی   اور دل میں دمبدم ہے تگ و دَو لگی ہوئی
کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے   اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے
بیٹھے اُسی کی آس پہ ہیں دل دیئے ہوئے   کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لئے ہوئے

بادِ مراد دیتی ہوائے مراد ہے   پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر   اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید پر
اے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر

دل دے رہا جو شیرِ محبت کے جام ہے   ہاں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی   بچے کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے   ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

پر ہائے حیف حال اسی جاں بلب کا ہے   سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر تو اغذا میں رہا غیر حال ہے   لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی   اور بے کسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات تجھ کو شکر یہی بار بار ہے   اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کون اس کا ساتھ دیوے گا ہو صبح جب تلک
روئے گا کوئی شام کے مرنے کو کب تلک

آزاد آفریں تری لطفِ زبان کو   پر کروٹ اب ہے رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دیئے ہوئے   تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پیے ہوئے
کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقتِ سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

مثنوی موسومہ بہ صبحِ امید

جب کیا صبح نے روشن فلکِ مینائی — بسترِ خواب سے میں لے کے اُٹھا انگڑائی
اُٹھ کے مِل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں — ذرہ ذرہ میں نظر آیا رُخِ جانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہِ دور انداز — تھا کُھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرتِ راز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ — جس پہ ہے فرشِ زمیں گلشنِ گردوں کی شکوہ
برگ برگ اُس کا ہے آئینہ لئے پیشِ نظر — جن میں ہیں جلوہ نما دل کے مرادوں کے ثمر
آرزوؤں سے کِھلے ہیں گُلِ رعنا یکسر — جن سے نکلیں گے ثمرہائے تمنا یکسر
قلۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہمراز — رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہ دراز
تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اُسکی — اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اُسکی
اُسکے چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے — دم اُکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے
گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو — کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو
کہ چڑھائی جو نظر آ رہی تھی دور بہت — دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت
جشنِ شاہانہ کا سامان نظر آتا تھا وہاں — سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں
دل اس آواز پہ اس طرح کھنچے جاتے تھے — گویا ذرے سوئے خورشید اُڑے جاتے تھے
اِس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا — جیسے بلبل سوئے گُل کبک سوئے ماہ چلا
کاہ کی طرح سوئے کاہ رُبا پہنچا میں — الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا میں
دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں — گُلِ خود رو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں
مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر پا انداز — رنگِ گُل اس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز
بر سرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری — نہر نہر بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر پہ ہے بدامانِ جبل مار رہا   سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا
سنگِ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی   اُس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی
رنگِ رُخ کو گُلِ گلزار سے چمکائے ہوئے   بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے
اس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال   پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال
نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے   فرشِ گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے
سر پہ جو اُس کے دھری ہے کُلہِ تاجوری   ہے سجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری
اُس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ   کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ
اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے   ہر دماغ اُس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے
رُخ جو ہے آئینۂ روئے تمنا اُس کا   شمع ساں چاروں طرف ایک سا ہے جلوہ اُس کا
اک طرف عقل ہے اک سمت ہے تدبیر کھڑی   آگے جامِ مئے غفلت لیے تاثیر کھڑی
دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا   کامیابی کی دکھاتی ہے تصویر جدا
رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اُس کی   پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اُسکی
ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے   تڑپ اُٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے
اس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے   اپنے دامانِ تمنا کو ہیں پھیلائے ہوئے
دمبدم ہے جو نسیمِ سحر آتی جاتی   بوئے امید ہے ہر اک کو سنگھاتی جاتی
دل نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھ کو   اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو
دیر تک دل رہا تصویرِ تہِ آئینہ   پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ
غور کی راز نہفتہ ہیں بہت سی میں نے   شجرِ چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال   دونوں پر کھولے ہوئے ہے بہ ہوائے اقبال
دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوش حالی   آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی
آؤ تم قیدِ تعلق سے ہو آزاد بہت   اپنی وارستگیٔ دل میں ہو تم شاد بہت

آؤ ہاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو — لاؤ کیا آرزوئے دل ہے کہ دیویں تم کو
آؤ اس سایہ میں تم ابرِ گہر بار ہے یہ — یعنی شہزادیٔ امید کا دربار ہے یہ
اُس کے نغمے سے جو یہ رازِ پُرافسوں نکلا — دل سے بے ساختہ یہ مطلعِ موزوں نکلا
× آکہ آباد ترے دم سے ہے دائم دُنیا — اور مَثَل ہے کہ بہ امید ہے قائم دُنیا
× آکہ ہے تیری ہوا میں دلِ شیدا گلشن — لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن
دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا — کونسا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا
× کونسا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا — کون انساں ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا
× کونسا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں — کونسا گُل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں
× کونسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری — کونسا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری
× تار برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے — دیکھا جس ملک میں واں سکّہ ترا چلتا ہے

عہدِ آیندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل — غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل
اُس میں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا — اُسی میداں میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا

× ذرّہ ذرّہ سے ترے اُگتے ہیں اشجارِ مراد — خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزارِ مراد
جب ہے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی — اور ہوا باغ میں ہے خاک اڑاتی پھرتی
چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے — چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے
پیرِ دہقاں ہے کہیں بے سر و ساماں بیٹھا — باغباں خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا
ہوتا اُس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی — نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی
ہاں مگر تو کہ جب اس وقت میں آجاتی ہے — جلوہ گر باغِ مراد اُس کو دکھا جاتی ہے
ابرِ تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی — پھلے پھولے اسے اشجار دکھاتی ہے کبھی

کبھی کھیتوں کو ہرا کر کے دکھا دیتی ہے — کر کے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے
دم بدم تازہ فسوں آ کے سناتی ہے اسے — باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اسے
تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ — اٹھ کھڑا ہوتا ہے یک بار کمر باندھ کے وہ
دھوپیں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا — کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا
ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اس کا — تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اس کا ×

اہلِ ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ — مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ
کوہ و صحرا میں ہیں وہ زادِ سفر باندھے ہوئے — اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے
نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا — اٹھ گیا ان کے نصیبوں سے زمانے کا مزا
ہر قدم پر بسرِ راہ خطرے ہیں لاکھوں — ایک جو کھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں
خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی — صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی
دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ ان کا — اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ ان کا
ہر قدم تو ہے مگر ان کی کمر باندھ رہی — سمتِ مقصود پہ ہے تارِ نظر باندھ رہی
حسنِ انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں — کرسیاں جاہ و مراتب کی دکھاتی ہے کہیں
سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے کہیں — اور خزانے کہیں پر مال دکھاتی ہے کہیں
کامیابی سے کہیں پھر ہے وطن میں لاتی — آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی
طائرِ دل پرِ پرواز ہیں پھیلائے ہوئے — اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازارِ ستیز — تیغ خوں بار کہیں اور کہیں خنجر خوں ریز ×
ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا — عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا ×
نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں منہ پھر جاتے — بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اڑ جاتے ×

کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے
سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے
پہ وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی
ہاتھ میں ہے لئے اک شیشۂ جادو آتی
ایسا مست مئے جرأت انہیں کر دیتی ہے
بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے
کہ نشا آنکھوں پہ عینک سے ہے لگاتا گویا
سبز فانوس خیالی سے ہے دکھاتا گویا
دیتی ہے چشم تصور میں ہر اک کام دکھا
ہے پھر اس کام کا دیتی انہیں انجام دکھا
کہ رخ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری
زیب سر دیکھتے ہیں تاج سپہ سالاری
فتحیابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی
پیش لشکر ہے بسرداری لشکر لاتی
شہرت عام کے دربار میں لاتی ہے انہیں
فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے انہیں
نام پر فتح کے نقارے بجا دیتی ہے
شرق سے غرب تک اک دھوم مچا دیتی ہے
پرچم فتح کبھی لا کے ہے لہرا دیتی
فتحیابوں کے ہے سر پر اسے جلوہ دیتی
نام اک اک کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں
ان کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
سیکڑوں دور فلک سر پہ گزر جائیں گے
وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئیں گے

دیکھتی چشم تصور ہے یہ جب بالغ مراد
اور چمکا اٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغ مراد
سر بکف بر سر میداں ہیں دلاور آتے
اہل جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے
جام دل خون شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
نعرۂ اہل وغا تا بفلک جاتے ہیں
آتے جانباز جو ہیں سر پہ کفن باندھے ہوئے
اور ہوائیں بسر چرخ کہن باندھے ہوئے
آب شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں
خوں دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہہ جاتے
اور جگر سینوں میں خوں ہو کے ہیں رہ رہ جاتے
گرم ہو جاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں
کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
جان و تن موت کے منہ کا ہیں نوالا ہوتے
آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے

غنچہ بابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے — اور بہت تن بسرِ خاک ہیں پُرخوں ہوتے
اے امید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے — یوں ہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم — اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالبِ علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے — حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کی ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال — ذوقِ راحت ہے نہ ہے لطفِ جوانی کا خیال
ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح — بلکہ پیوند ورق ہیں جزو اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے — ہاتھ اُٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں — دن ہو یا رات انہیں محنت کے سوا کام نہیں
روز و شب خونِ جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ — اور بلا بارِ مشقت کے اُٹھاتے ہیں وہ
اِن مصائب کی ہے تو ہی اُنہیں طاقت دیتی — لُطفِ انجام سے ہے حُسنِ لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سُرمے کیا کیا — دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا
اہلِ تصنیف کو ہے عُمرِ دوامی دیتی — بادۂ شوق سے ہے عیشِ مدامی دیتی
سطح کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے — برگ و بار اُس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے
عوضِ آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات — اور دکھا دیتی ہے اِس طرف سے شادابِ حیات
شہرۂ گلزار زمانہ میں رہے عام اُن کا — پتے پتے پہ سدا نقش رہے نام اُن کا

کبھی طیار لیاقت کے ہے تمغے کرتی — کہیں ایم اے ہے بناتی کہیں بی اے کرتی
بر سرِ کرسیِ دربار بٹھاتی ہے اُنہیں — خلعتِ بوقلموں لا کے پنھاتی ہے اُنہیں
بزم کو جلوۂ رنگیں سے ہے دکھاتی اُن کے — اِس طرح فخر سے دامن ہے اُڑاتی اُن کے
ہوتے شاداب ہیں دلہائے فسردہ اُن کے — تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دلِ مردہ اُن کے

کلفتِ محنت و آفت سے ہیں ہم جی جاتے — زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا — دشتِ پُرخار میں ہے بے سروساماں جاتا
نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لئے — اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لئے
اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اُسے — رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے
طپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینہ میں — بُجھ کے رہ جاتا ہے دل مثلِ شرر سینہ میں
دفعتاً آبِ رواں دُور نظر آتا ہے — اور وہ اس لُطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے
کہ دلِ سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا — اور خوشی سے تنِ بے دم میں ہے دم آجاتا
دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے — جاتا ہے بے سروپا دوڑتا بےتابی سے
جامِ ہمت جو اُسے تُو نے ہیں پلوائے ہوئے — کوسوں اک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے
زورِ ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی — اُتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے — دلِ مایوس کو جب اُس کے یقیں آجائے
کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ — سیرِ دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ
یہ سمجھتے ہی ہے اندھیر جہاں آنکھوں میں — ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں
دل میں ہمت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی — صورتِ نقشِ قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی
جان پانی میں ہو اٹکی ہوئی دم سینہ میں — وہ بھی پر ضعف سے آکر رہے تھم سینہ میں
اُس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تُو — سرِ بالیں وہ مسافر کو لئے لاتی ہے تُو
حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آتا — ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا
اُس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اُس کے لئے — ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اُس کے لئے

کرتے زاہد ہیں خدا کی جو عبادت دن رات — ترکِ دنیا سے ہیں سرگرمِ ریاضت دن رات
ذکرِ فردوس ہیں تو نے انہیں سنتے ہوئے — لطف ہر دم ہیں وہی پیشِ نظر آتے ہوئے
رندِ آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ — بارِ عصیاں سے ہے بےچارہ گرانبارِ گناہ
نہیں بجز رحمتِ حق کوئی سہارا اس کا — تیری ہی چشمِ کرم پر ہے گزارا اس کا
تو نہ ہووے تو تڑپ کر دلِ مضطر رہ جائے — وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جائے

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا — کارِ اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا ×
ہے شبِ تار تو سونے سے انہیں کام نہیں — دن کو جز فکرِ مضامیں کبھی آرام نہیں ×
لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے — اور یہ بیٹھے دُرِ مضمون ہیں پرویا کرتے
یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اُٹھائے بیٹھے — یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے ×
باغ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے انہیں — مژدۂ خلعت و انعام سناتی ہے انہیں ×
انہیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے — ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے ×
کہ جو آہ ان کے دلِ سوختہ جاں سے نکلے — یا کوئی نالۂ موزوں کہ زباں سے نکلے ×
اثرِ درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا — اور جگر درد سے لبریزِ اثر ہووے سدا
ہووے اسیر بھی جو آشوبِ جہاں حد سے زیادہ — قولِ آزاد سے کرتی ہے انہیں یوں ارشاد ×
کہ سخن فہم تہِ چرخِ بریں ہوئیں گے — خوردہ بیں ہیں تو سخنداں بھی یہیں ہوویں گے ×

داد مل جائیگی جب اور کوئی دیکھے گا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھے گا

مثنوی حبِّ وطن

حالی

ہے قول جملہ تجربہ کارانِ فارسی — اور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی

حبِّ وطن ز ملکِ سلیماں نکوتر است — خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است

سلطانِ دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے — اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملکِ مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور — اس سلطنت کو چاہیئے طرزِ نظام اور

حبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے — نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حبِّ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو — ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

یا ہو گہر جو لوٹتا دریا کی یاد میں — داخل ہو وہ بھی زمرۂ اہلِ وداد میں

حبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ دید — آرامِ جان و تن کو جو سمجھیں گھروں میں عید

آبِ خنک ہو سامنے اور نانِ گرم ہو — اور رونقِ خواب فرش بھی سونے کو نرم ہو

یا الفتِ وطن نہیں ہرگز کہ باغ میں — سودا ایکا ئے بلبلِ شیدا دماغ میں

آخر شکارِ دام ہو گلشن کو چھوڑ کر — یادِ چمن میں جان دے سر پھوڑ پھوڑ کر

حبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش — یادِ وطن میں ہووے گے جوش گہ خروش

بچوں کی طرح روتے سدا زار زار ہوں — اور مادر و پدر کے لئے بے قرار ہوں

اہل و عیال کا نہ گوارا فراق ہو — اور یار کا فراق بہت دل پہ شاق ہو

حبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں — بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

ہے کوئی گود میں کوئی گردن کا ہار ہے — بی بی کہیں میاں کو بہت مجھ سے پیار ہے

روئیں سفر میں دوست گئے یار کیلئے — اور گاہ سیر کو چلے بازار کے لئے

اے دوست یہ تو دوستیِ سنگ و خشت ہے — یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

×آیا یہ دھیان آج جو وقتِ سحر مجھے   اک نقل یاد آگئی اِس اصل پر مجھے

دلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے   جو باکمال اُس میں ہے وہ بیمثال ہے
اک شخص واں ستارنوازی کی جان تھا   پر جان سے عزیز تھا دلّی کو جانتا
آیا دکن سے خلعت و زر اُس کے واسطے   اور نقد بہرِ زادِ سفر اُس کے واسطے
ہر چند مُنہ تو دلّی سے موڑا نہ جاتا تھا   پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا
مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے   اسباب سارا راہ سفر کا سنبھال کے
دلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے   پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے
پہنچے مگر ابھی تھے درِ راج گھاٹ پر   جو دفعتہً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر
دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا اُن کا دل   اور دلّی چھوڑتے ہوئے بھر آیا اُنکا دل
مُنہ پھیر کر نگاہ جونہی شہر پر پڑی   جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی
تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا   اور اُن کو لیچلا وہ چھُڑا کر وطن سے تھا
دیکھا نگاہِ یاس سے اور اُس سے یہ کہا   پیچھے چلینگے پہلے مگر یہ تو دو بتا
ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں   مُنہ دیکھکر وہ اُن کا ہنسا اور کہا کہ نہیں
پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا   مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا
وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے   اِس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے   اُتری زمیں پہ جس کی شبیہ آسمان سے
یہ بات اُسکی سُنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے   اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے
جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں   سُنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں
اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں   ہم اِس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں
اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑیبان پھیر   گر اب پھرے سے منہ یہاں تو قسمت کا جانِ پھیر

× ہم اپنی دلّی چھوڑ دکن کو نہ جائینگے　　گریاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

× ایسے ہی ننگ حبّ وطن بدنصیب ہیں　　گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں
× کہتے ہیں دُکھ اُٹھانا ہو یا درد سہنا ہو　　تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو
× اب میں تمھیں بتاؤں کہ حُبّ وطن ہے کیا　　وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
× وہ رحمتِ خدا ہے کہ بندوں پہ عام ہے　　وہ لطفِ عام جس سے جہاں شاد کام ہے
وہ نورِ مہر جس سے زمانہ میں نور ہے　　وہ نور ذرّہ ذرّہ پہ جس کا ظہور ہے
× حبِ وطن ہے جلوہ اُسی نورِ پاک کا　　اور روشن اُس کے نور سے عالم ہی خاک کا
× ہو مہر میں یہ نور تو اُس کو کرن کہیں　　گر دل سے جلوہ گر ہو تو حُبِّ وطن کہیں
× رکھتا جو سب پہ لُطف و کرم کی نگاہ ہو　　اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
× آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو　　ہاتھ اپنا جیبِ نفع میں ہو یا ضرر میں ہو
× ہر حال میں رہیں اُسے اہلِ وطن عزیز　　اور ہو وہیں نیک و بدر وشِ جان و تن عزیز
× حبِّ وطن کے ملک میں فرمانروا ہے وہ　　تاج و سریر ہو کہ نہ ہو بادشا ہے وہ
اور جس وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینہ میں　　اس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینہ میں
لیکن یہ راز اہلِ حقیقت سے پوچھئے　　اس کا طریق پیرِ طریقت سے پوچھئے
دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا　　ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا
حب الوطن کی راہ میں گرمِ نفس ہے یہ　　نالاں غمِ فراق سے مثلِ جرس ہے یہ
یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتہ کہاں　　بلبل تھا کس چمن کا میں اور آ پھنسا کہاں

جنت سے آئے آدم و حوّا زمیں پہ تھے　　رکھتے جو قبضہ گلشنِ خلد بریں پہ تھے
میراث اپنی گلشنِ جنت کا باغ ہے　　حق ہے اگر فراق سے دل داغ داغ ہے

پر آفریں ہے حضرتِ انساں کی ذات کو بھولے نہیں ہیں آج تلک اپنی بات کو
لیتے وطن پہ قبضہ ہیں دے دے کے جاں تلک آخر پہنچ ہی رہتے ہیں باغِ جناں تلک

آزاد خیر ہے کدھر آیا خیال ہے تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے
جانا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں
دنیا ز بسکہ مزرعِ عقبےٰ تمام ہے سرسبز کرنا اس میں بھی لازم کلام ہے

لکھتے ہیں اس طرح سے مورخ فرنگ کے دانا رموزِ معرکۂ صلح و جنگ کے
یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے دونوں کے اہلِ ملک مگر جاں نثار تھے
سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا دونوں کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا
آخر کو تھے جو واقفِ اسرارِ سلطنت سمجھے بہم یہ مصلحتِ کارِ سلطنت
دو جاں نثارِ ملک روانہ اُدھر کریں اور اپنے دو اِدھر کو وہ گرمِ سفر کریں
تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں سرحد ملک کے وہیں قائم منار ہوں
جاں باز اُس طرف کے مگر جان توڑ کر ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر
اک حصہ طے نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا یہ تین حصہ بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا
لیکن حریفِ شرط کے میداں کو چھوڑ کے بولے یہ عہدِ قول و قرار اپنا توڑ کے
وہ اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں پھر اب کے دو طرف سے رواں ایکبار ہوں
پر اپنی بات پہلے ہر اک شخص جان لے اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے
یعنی جو شرط جیت کے خورسند ہوئیگا سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہووے گا
جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے حب الوطن کے جوش سے بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی اور بات جو کہ ہونی ہے پھر وہ ابھی سہی

پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو | سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونوں اسی جا پہ اڑ گئے | جیتے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

× اور ہے لکھا مؤرخِ عہدِ قدیم نے | روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے
× تیار اہلِ فوج سپاہی کارزار تھے | پر اہلِ ملک اُن سے سوا جاں نثار تھے
× آیا حریف جب کہ نہایت قریبِ شہر | اُٹھے برائے جنگ امیر و غریبِ شہر
× پر اُن میں کوکلیز جو مردِ دلیر تھا | حُبِّ وطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا
× نکلا وہ سج کے اسلحہ جنگ اپنے شہر سے | اور لشکرِ عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثار حبِّ وطن اور ساتھ تھے | اعدا کے خوں میں ڈوبے ہوئے جن کے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحرِ گنگ کا مائی لقب یہاں | تھے ٹائبر کو باپ کہا کرتے سب وہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر | پل سے اتر کے آتے یہ دشمن کی فوج پر
پل کا دہانہ روک کے تینوں کے گھاٹ سے | اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم | حملہ تو ہم نے روک لیا پل گراؤ تم
سمار ادھر وہ کرتے رہے پل کو آن کر | یہ تیر و نیزے مارتے گئے تان تان کر
پل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا | اک آدمی کا راہگذر جیسے رہ گیا
تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم | اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم
قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو چھوڑ دو مجھے | تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے
اک اک رفیق جب کہ ادھر پار ہو گیا | اور پل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا
للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے | اور ٹائبر میں کہہ کے یہ کودا دھڑام سے
ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو | اے میرے باپ بھیجو اپنے سپاہی کو
دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی | اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی

دیکھو تو فیضِ حبِّ وطن اُس کو کیا ملا　　جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا ×

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دل لالہ زار تم　　اور رہو بہ تیغِ حبِّ وطن دل فگار تم
ایرانیوں کے عہدِ کیانی کو دیکھ لو　　اُس بحرِ سلطنت کی روانی کو دیکھ لو
کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو　　کیا کیا عروج دے کے بڑھایا ہے ملک کو
کیا کیا خجل کیا ہے سپہرِ بنفش کو　　کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو
اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار ہیں　　کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں
ان میں بھی بیستاں کے بہادر وہ شیر تھے　　جن سے کہ اک جہاں کے زبردست زیر تھے
کرتے تھے عیش دامنِ کہسار میں کبھی　　اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی
مثلِ غزال دشت میں کرتے کلیل تھے　　جنگِ پلنگ و شیر اُنہیں بچوں کے کھیل تھے
آبِ رواں پہ پیتے بہاروں کے لطف تھے　　تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے
پر سنتے جب کہ شاہ بعزمِ غنیم ہے　　یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے
درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں　　ہوں گھر میں یا کہ وادیٔ نزدیک و دور میں
جس حال میں ہوں بے سروپا اُٹھ کے دوڑتے　　روئے زمیں سے مثلِ ہوا اُٹھ کے دوڑتے

اور ان میں شانِ رستمِ دستاں کی دیکھئے　　اُلفت وطن سے شیرِ نیستاں کی دیکھئے
وہ جس طرف بپھر کے بشکلِ بلا چلا　　بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلا چلا
وہ گرزِ گاؤ سر کو دھرے تا بہ زین پہ　　لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاوِ زمین پر
ریشِ دو شاخ دوش پہ ہو اپر اڑی ہوئی　　افعی کے پیچ و خم میں وہ مونچھیں مڑی ہوئی
فولاد کا وہ خود جو کلّہ تھا شیر کا　　کرتا فزوں تھا دبدبہ گُردِ دلیر کا
بر میں وہ چرمِ شیر کا خفتاں پھنسا ہوا　　اور پائے عزم ناف زمیں میں دھنسا ہوا

پا کھڑ پڑی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی — اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی ڈھال کی
جانا چھڑانے شاہ کو مازندران میں — لڑنا وہ دیو ودد سے رہِ ہفت خواں میں
وہ بار بار معرکے افراسیاب سے — ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے
جب گرم کارزار ہوا خوں بہا دیئے — اور دشمنوں کے خون سے جیحوں چلا دیئے
وہ سیستاں کا شیر عجب کام کر گیا — حب الوطن کے معرکہ میں نام کر گیا

ہر چند شہرہ خلق میں رستم کا عام ہے — اور لیتا آج تک بھی ہر اک اُس کا نام ہے
پر جو وہاں دلاور فرخندہ کام تھے — حب الوطن کے رستم دستان و سام تھے
جب سُنتے تھے کہ شاہ کہیں گرم جنگ ہے — یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے
سوتے ہوں یا کہ بیٹھے ہوں یا مست خواب ہوں — یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں
حب الوطن کے جوش میں ہر کام چھوڑ کر — چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر
اور معرکہ میں جنگ کے پھر جوش عزم میں — گرز و کمند و تیغ سے میدانِ رزم میں
لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جان کھوتے تھے — اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے
میدانِ جنگ جیت کے ہمت کے داؤں میں — لاتے تھے اپنے شاہ کو تیغوں کی چھاؤں میں
چہروں کو رنگ دے کے گلِ نو بہار سے — جاتے تھے گھر کو معرکۂ کارزار سے

حب الوطن ہے نور میں ہمنورِ آفتاب — اور کرتا ہے ظہور بدستورِ آفتاب
اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے — اک جا جو روشنی ہے تو اک جا اندھیر ہے
آج اُس کا آفتاب ہے اوجِ فرنگ پر — اور رات ہند کی ہے رخِ تیرہ رنگ پر
ہے کچھ حساب اُور وہاں کی کتاب کا — رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا
جانباز ہیں تو بہرِ وطن جاں نثار ہیں — اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں

قائم ہو تا کہ دبدبہ اہلِ عزم و دبیر پر — اور بیٹھے سکّہ ملک کا نزدیک و دور پر
وہ مال کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو — دیتے ہیں بشان اپنے وطن کے نشان کو

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت — ہیں دل میں رکھتے مایۂ دانشوری بہت
ٹپکاتے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں — اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں
تا ہوئے سُراب وطن آب جو نصیب — اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو نصیب
شائستگی کے ساتھ رواجِ کمال ہو — علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں — ہر چند فکرِ مال میں لیل و نہار ہیں
کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مال و جان کو — طے کرتے ہیں بپائے سیاحت جہان کو
لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکرِ زر انہیں — حب الوطن کا نقش ہے پیشِ نظر انہیں
کرتے ہیں دانہ دانہ بہم خوشے خوشے سے — اور ذرّہ ذرّہ ڈھونڈتے ہیں گوشے گوشے سے
چُنتے ہیں ساتھ مال کے علم و ہنر کے پھول — تا کہ گلشنِ وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول
دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا — اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہلِ وطن سدا

ایسے بھی اُن میں صاحبِ ہمت نصیب ہیں — دار الشفائے حُبِّ وطن میں طبیب ہیں
عالم میں بہرِ تجربہ پھرتے ہیں گشت کو — اک اک قدم میں ناپتے وہ کوہ و دشت کو
ہیں ذرّہ ذرّہ چھانتے دریا و کان کا — ہیں برگ برگ دیکھتے باغِ جہان کا
ہیں گاہ گاہ ڈال میں گہ پات پات میں — ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں
اک اک ورق میں صورتِ تحریر دیکھتے — اور اس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے
تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا — اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا

پر اُن میں وہ ہے زینتِ تاجِ نگیں سدا   اور زیبِ سر ہیں اُس کے گُلِ آفریں سدا
لایا جو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں   آیا وطن کو چھوڑ کے ہندوستان میں

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک   اور غیرتِ نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا   یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں   تھا مبتلا وہ ایک مرضِ لاعلاج میں
سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے   سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے
پر اس مسیح دم نے جو آکر کیا علاج   ایسا عجب طبع موافق پڑا علاج
گویا دوا بہ کارِ دعا ہو گئی اُسے   اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے
نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں   اور جان تازہ آگئی اک اک کی جان میں
فرخ سیر کہ شاہ سخاوت مآب تھا   بحرِ کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا
اک جشنِ عام اُس نے کیا دھوم دھام سے   اور شورِ تہنیت کا اُٹھا خاص و عام سے
حاضر ہوئے امیر و وزیر آ کے سامنے   اور اُس طبیب کو کہا بلوا کے سامنے
لا دامن ایسا کہ بھر دیں ابھی اُسے   تا عمر بھر نہ پائے تو خالی کبھی اُسے
دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا   ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پہ نظر ذرا
حب الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا   دل آب ہو کے سینہ میں سیماب ہو گیا
کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی   بندہ کو آرزو نہیں کچھ عز و جاہ کی
زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے   پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے
کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو   جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو
بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے   جو مانگتا ہے مانگ سبھی اختیار ہے

تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے — روشن جلال شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی زمیں نواحیٔ دریا کنار میں — مجھ کو عطا ہو مملکت شہریار میں
تا اِس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں — اور اُن میں تاجران ذوی الامتیاز آئیں
پھر اُن پہ ہووے راہ نہ بیم زوال کو — آرام سے اُتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دور سے — محصول سب معاف ہو اُس کا حضور سے

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا — یہ نسخہ لیکن اُس سے سوا پُر اثر پڑا
اُس کی بھی یعنی کلفت غم دور ہو گئی — اور تھی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہو گئی
ہر چند اُسے نہ فائدۂ سیم و زر ہوا — پر نفع بہر اہلِ وطن کس قدر ہوا
دامن میں اک عطائے خداداد پڑ گئی — اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی
نوبت بجا کرے گی سدا صبح و شام کی — آوازدیں گے طبل نگہ اُس کے نام کی

اے آفتاب حبِّ وطن تُو کدھر ہے آج — تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا — اور انتظام دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مُردہ ہو رہے — اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے — کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حُبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں — حیراں ہوں آجکل ہے پڑا اسکا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں — حبّ الوطن کے بدلے ہی بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں — جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو — اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
عالم سے تا کہ تیرہ دلی دُور ہو تمام — اور ہند تیرے نُور سے معمور ہو مدام

اُلفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم — اور جو کہ ہموطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور — اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور
سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں — اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں — اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

بریز جوشِ حُبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

مثنوی خوابِ امن

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا — دل نے بھی کرسیِ آرام پہ آرام لیا
میں کہ دن بھر کی مصیبت سے تھکا ماندہ تھا — مکتبِ دیدہ کا پرشانِ ناخواندہ تھا
دمبدم دورِ فلک تازہ سبق تھے گویا — رات دن مجھ کو زمانے کے ورق تھے گویا
شبنمِ امن و اماں سے کبھی شاداب جہاں — اور کبھی شعلۂ آفات سے بیتاب جہاں
بود و نابود جو نظروں میں تلے جاتے تھے — معنیٔ کون و فساد اُس میں کھلے جاتے تھے
دفعۃً سامنے لیلائے شبِ تار آئی — کرتی ایک اک کو مئے شوق سے سرشار آئی
گرچہ لائی تھی نہ ساماں مئے و مینوشی کا — ہاتھ میں شیشہ تھا پر دارو ئے بیہوشی کا
چال سے سُرمۂ حیرت کے غبار اُڑتے تھے — حال سے دیدۂ غفلت کے خمار اُڑتے تھے
ایسے انداز سے دامن تھی ہلاتی آتی — سب کو تھی امن کے سایہ میں سُلاتی آتی
اُس کا جھوکا ہوا غفلت کا حجاب آنکھوں پر — خوابِ شیریں نے کیا کارِ نقاب آنکھوں پر
خواب گو کارِ جہاں میں خللِ انداز ہوا — پر خیالاتِ دلی کو پرِ پرواز ہوا
ذوقِ گلگشت کا اک دے کے اشارہ مجھکو — ایسے گلزاروں میں لے جا کے اُتارا مجھکو

کہ نہ تھا فصلِ بہاری پہ سہارا اُن کا   تھا چمن بند طبیعت چمن آرا اُن کا
اُس قلمرو میں رواں تھا قلمِ امن و اماں   پتّے پتّے کے ورق پر رقمِ امن و اماں
پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا   موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا
سرکشی سروِ سرافراز دکھاتی ہی نہ تھے   سینہ زوری کے بگولے اِدھر آتے ہی نہ تھے
زلفِ سنبل کی سیہ تھی پہ سیہ کار نہ تھی   خم تو تھے اُس میں مگر پیچ سے خمدار نہ تھی
سرِ شمشاد کا طُرّہ وہاں طرّار نہ تھا   شوخیٔ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا
دھوپ کا رنگ چمکتا تھا تو ٹل جاتی تھی   اور نسیم آ کے دبے پاؤں نکل جاتی تھی
صبح یہ تاب نہ رکھتی تھی کہ دم مار سکے   یا صبا پاؤں کی آہٹ سے قدم مار سکے
پر جب آتی تو شگوفہ بھی نیا لاتی تھی   ایسا کچھ پھونک کے کانوں میں چلی جاتی تھی
ہنستے تھے پھول پہ کھلتی گرہِ راز نہ تھی   لوٹ جاتے تھے نکلتی مگر آواز نہ تھی
مرغ واں نغمۂ بے صوت و صدا گاتے تھے   اور شجر موجِ ہوا میں پڑے لہراتے تھے
برگ سے برگ و لیکن نہ کھڑک سکتا تھا   خار کی نوک میں دامن نہ اٹک سکتا تھا
لوریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے   سوتے آرام سے تھے چین کے بندے سارے
باغباں قدرتِ حق کا تھا جو آیا اُس جا   تختہ اک تھا گلِ خودرو کا لگایا اُس جا
دامنِ کوہ سے چشمہ جو ہوا تھا جاری   آبِ شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری
اس پہ جھرمٹ میں درختوں کے لبِ جو کی بہار   اور لبِ جو پہ وہیں سبزۂ خودرو کی بہار
شیر بکری وہاں اک گھاٹ تھے پانی پیتے   جامِ اُلفت تھے بہم دشمنِ جانی پیتے
جلوہ گر بیچ میں اک قلعۂ شاہنشاہی   گنبدِ امن تھا یا گنبدِ بسم اللّٰہی

در و درباں کی ضرورت تھی نہ زنہار وہاں
پاسباں امن کا دن رات تھا ہشیار وہاں

خسروِ امن کا دربار

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت
امن کو سمجھا غنیمت دلِ غمدیدہ بہت

شوقِ دل لیگئے غرض قصر میں آیا مجھ کو
پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھ کو

خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار

اُس کے آنگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا
دھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا

صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہاں ہر دم آگے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار
کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار

دل میں افکارِ پریشاں کا نہ تھا نام وہاں
ہاتھ جمعیتِ خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامنِ امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

علم امن کا شکریہ کرتا ہے

دفعتہً دیکھا کہ اک پیرِ کہن سال آئے
پر عجب شان سے اک مردِ خوش اعمال آئے

چشمِ پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا
اُن کی مقدارِ فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرے پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رُخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریش مقدس میں کیا پیری نے اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اٹھائے لاتے اور بغل بیچ کئی جزدان دبائے آتے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہ امن کے آگے آئے پہلے سب نے بہ ادب دستِ دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے علم نے بھیجا ہے تقدیم رسالت کے لئے

اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا ہے ہر اک شہرتِ تعریف سے مصروف سدا

اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں اور جہاں میں انہیں فکرِ سحر و شام نہیں

دمبدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے آتے ہیں کارگہ دہر میں استاد نئے

درس و تدریس کے چرچے ہیں جو گھر گھر جاری ہیں یہ جمعیت خاطر کی ہی باتیں ساری

جو ہمیں چاہیئے موجود ہیں سارے ساماں ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہِ امن یہ سب فیض کرم تیرے ہیں کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

زراعت شکریہ کرتی ہے

تھا انہوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا اور نہ تھا علم نے طومار لپیٹا اپنا

دیکھا انبوہ ہے اک حد سے زیادہ آتا ہے سوار ان میں کوئی کوئی پیادہ آتا

گھوڑیاں آگے سواری میں بچھیرے پیچھے اور کئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے

گود میں ہے کوئی گوسالہ اٹھائے آتا کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا

نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں نئی فصلوں کے اناج ان میں بھرے لاتے ہیں

طرے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے

ہمت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں اُنکے   تندرستی کے نشاں مُنہ پہ عیاں ہیں اُن کے
دیکھ اُنہیں سب علما ہٹ کے کنارے آئے   بے تکلف سرِ دربار وہ سارے آئے
اور کہا سب نے کہ اے بادشہِ امن و اماں   تجھ سے جاری ہے زمانے میں رہِ امن و اماں
کر کے طے گھر سے بہت فرسخ و میل آئے ہیں   جانبِ اہلِ زراعت سے وکیل آئے ہیں
کہ وہ صحرا میں جو ہیں بیٹھے سہارے تیرے   آسرے رکھتے ہیں دن رات بچارے تیرے
کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دُعا کرتے ہیں   گھر میں ہیں تو تو ترا شکر ادا کرتے ہیں
تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے   خاک پر آب زمرد کو بہا جاتا ہے
کشتِ امید زمانہ کی ہری ہے تجھ سے   سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے
پیرِ دہقاں کہ جو ہے سایہ میں تیرے بیٹھا   جان و مال اپنا ہے مٹی میں بکھیرے بیٹھا
سایۂ امن ترا اُس کو ہرا رکھتا ہے   صرصرِ فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے
تُو بچاتا ہے زمانے کی لگد کوبی سے   ترکتازِ حوادث کی پُر آشوبی سے
فیضِ رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اُسے   زور تیرا ہے کہ زر کر کے اُٹھاتا ہے اُسے
کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو   تُو ہی اک دانے سے ہے پالتا سو دانوں کو

تُو نہ ہووے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلق خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ کرتی ہے

سخن اُن کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی   اور زراعت نے یہ خرمن نہ اُٹھایا تھا ابھی
لوگ کچھ اور بھی آئے پئے تقریر وہاں   دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں
گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتاتے تھے وہ سب   مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب
کہ ابھی قطع کئے راہ سفر آئے ہیں   ریل سے یا کہ جہازوں سے اُتر آئے ہیں

تھا کوئی دوش پہ خُرجین اُٹھائے آتا　　اور بغل میں کوئی بُگچہ اپنا دبائے آتا
رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلودہ　　دل تھے کُلفت زدہ اور سینے تھے درد آلودہ
دشت و دریا کے عجائب سے تھے وہ ہمراہ لئے　　تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پے شاہ لئے
خسروِ امن کے دربار میں جب آئے وہ　　بعد آداب زباں پر یہ سخن لائے وہ
اے شہِ امن دُعا خلقِ خدا کرتی ہے　　اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے
کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری　　شرق سے غرب میں جنسیں ہیں پہنچتی ساری
ہم اُٹھا لیتے ہیں نفع درم و دام اُن سے　　اور جو گھر بیٹھے ہیں وہ پاتے ہیں آرام اُن سے
کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے　　کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے
رہے جس جا پہ مسافر کے لئے گھر ہے وہیں　　رشتہ کنجشک جو چاہو تو میسر ہے وہیں
نہیں اصلا خطرِ رہزنیٔ دہر انہیں　　ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر انہیں
کوئی دم لیتا ہے رستہ میں کوئی سوتا ہے　　پر کہیں کیل کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا ہے
اے شہِ امن اگر لُطف ترا عام نہ ہو　　اور تری نظم پہ عالم کا سر انجام نہ ہو

ابھی بازارِ جہاں زیر و زبر ہو جائے
خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

صنعت و دستکاری

تھی نہ بات ان کی ابھی ختم پہ آنے پائی　　اور تجارت یہ دُکاں تھی نہ بڑھانے پائی
لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے　　لیکن اس رنگ سے وہ داخلِ دربار ہوئے
جیسے تختہ ہو گُلِ بوقلموں کا آتا　　یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا
خاک پر تھے گُلِ ایجاد لگاتے آتے　　پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے
دستکاری نے کیا لعبتِ چیں تھا اُن کو　　رنگ چمکا کے کیا نقش نگیں تھا اُن کو

چشمِ صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر ضعفِ بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر
تھے لئے نذر نہ کچھ گو ہر و زر ہاتھوں میں دستِ صنعت کے تھے گلدستہ تر ہاتھوں میں
غرض آ کر سرِ تسلیم جھکائے سب نے پیشکش لیکے جو آئے تھے دکھائے سب نے
کر چکے شاہ کا جس دم حقِ نذرانہ ادا تب کیا جانبِ صنعت سے یہ شکرانہ ادا
اے شہِ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا کہ اسی سائے میں اپنا بھی ہے بازار کھلا
دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے کام سب تیری بدولت ہیں ہمارے چلتے
تار ہے غیب کے اخبار سنائے جاتا ریل کا تختِ سلیماں ہے اڑائے جاتا
کارخانے جو پڑے چلتے ہیں دن رات یہاں اور کلیں کر رہی جو جو ہیں طلسمات یہاں

اے شہِ امن یہ تیری برکت ہے ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں حرکت ہے ساری

دولت شکریہ کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری زیرِ تقریر یہ تھے کر رہے مینا کاری
دفعةً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر ہو گئے سب در و دیوار طلائی یکسر
جیسے جھڑتے کبھی گلبن سے ہیں گلزار میں پھول چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول
کہ پری اتنے میں اک دوشِ ہوا سے آئی آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی
حسنِ رفتار سے تھی سرعتِ سیماب اڑتی جائے دامن تھی فقط چادرِ مہتاب اڑتی
حسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اس کا پر سراپا تنِ نازک تھا طلائی اس کا
ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اڑاتی چلتی بلبلِ نرگس دمِ رفتار کھلاتی چلتی
تھی نہ تھمتی روشِ گردشِ ایام اک جا لینے دیتی نہ تھی شوخی اسے آرام اک جا
جب کہ وہ غیرتِ نورِ سحری آ پہنچی پڑ گئی دھوم کہ دولت کی پری آ پہنچی

سامنے بادشہِ امن کے جس دم آئی
حُسنِ شکرانہ میں یہ نغمۂ دلکش گائی

کہ جہاں تیری بدولت ہے ہر اک حال میں خوش
ہے کوئی شال میں خوش اور کوئی کھال میں خوش

گھر وہ جن کا جو لاکھوں سے ہے معمور سدا
خوش ہے دو پیسے کی مزدوری میں مزدور سدا

زیردستوں کو ترے سائے میں خوش مستی ہے
اپنا سر پیٹتی ہاتھوں سے زبردستی ہے

ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا
مار کیا تاب جو بل مارے سرِ مور ذرا

بندوبستوں کا ضرر کچھ نہیں نقصانوں سے
ہاتھ ہیں دستِ درازی کے جُدا شانوں سے

ہے ترے نظم و نسق سے جو نظامِ عالم
شربتِ عیش سے معمور ہے جامِ عالم

فتنہ انگیزی غدر و آشوب کی

تھی پڑی زمزمۂ شکر سے دمساز ابھی
کہ عیاں جانبِ صحرا سے اک آواز ہوئی

وہ صدا سُنتے ہی فق ہو گیا دربار کا رنگ
اور ہوا ہو گیا یکسر گُل و گُلزار کا رنگ

اہلِ دربار کہ تھے بزم جمائے بیٹھے
غم و افکار سے ہاتھ اپنے اُٹھائے بیٹھے

مضطرب ہو کے ہر اک جانبِ آواز چلا
مرغِ دل میرا بھی کھولے پرِ پرواز چلا

چلتے چلتے غرض اک دشت نظر آیا ہمیں
ماجرا دیدۂ عبرت نے یہ دکھلایا ہمیں

یعنی اک مردِ دلاور ہے سرِ کوہ کھڑا
اور سرِ کوہ ہے گرد اُس کے اک انبوہ کھڑا

تمتمائے ہوئے ہیں دھوپ سے رُخسار اُسکے
لال انگارے ہیں دو دیدۂ خونخوار اُسکے

بدن اینٹھا ہوا اُبھرا ہوا سینہ اُس کا
کہ سدا مشقِ مشقت ہے قرینہ اُس کا

خنجر و امن سے ہے بسکہ بندھی لاگ اُسکی
کود آ گھوڑے سے ہے اور پکڑے ہی خود باگ اُسکی

نیزہ ٹیکے ہوئے ہے سب پہ نظر ڈال رہا
ہر نظر سے ہے شرارت کے شرر ڈال رہا

اور یہ کہتا ہے کہ اے امن کے بندو آؤ　　آؤ اے راحت و آرام پسندو آؤ
آؤ جلد آؤ کہ ہم مرد بنائیں تم کو　　جامِ جرأت خُمِ ہمّت سے پلائیں تم کو
کر دیا سلطنتِ امن نے بزدل ہے تمہیں　　نہ رکھا عیش و طرب نے کسی قابل ہے تمہیں
رات دن رہتے ہو آرام کے سامانوں میں　　دن کو گلشن میں ہو اور شب کو شبستانوں میں
خوابِ غفلت میں ہو تم پاؤں پسارے سوتے　　ہمّت و عزم بھی ہیں ساتھ تمہارے سوتے
جرأت و حوصلہ سے تم کو رہا کام نہیں　　ملک میں زور ترقی کا کہیں نام نہیں
خسروِ امن کی خدمت میں زمیں چومتے ہو　　رات دن بیٹھے افیمی کی طرح جھومتے ہو
اِس عمل نے ہے جوانی میں کیا پیر تمہیں　　کیا بے قید ہے وابستۂ زنجیر تمہیں

آؤ اِس قیدِ بلا سے تمہیں آزاد کروں　　اور ابھی صاحبِ اقبالِ خداداد کروں
زورِ بازو سے تم آفاق کو تسخیر کرو　　دستِ تقدیر کو وابستۂ تدبیر کرو
عیش نے ہے جو تمہیں جان سے رنجور کیا　　ضعف دل نے تمہیں ہمت سے ہے معذور
کر دیا امن نے جو عیش کا پابند تمہیں　　اور کیا بسترِ راحت کا ہے پیوند تمہیں
میں جہانگیر و جہاں گرد کروں گا تم کو　　مرد اگر ہو تو جواں مرد کروں گا تم کو
ناپ ڈالو گے انہیں قدموں سے میدانِ جہاں　　ایک کر دو گے ابھی دشت و بیابانِ جہاں
اپنے ہر کام کو آرام میں کھویا تم نے　　ملک کا نام زمانے میں ڈبویا تم نے
میں ابھی خاک سے افلاک پہ پہنچاؤں گا　　مثلِ خورشید جہاں میں تمہیں چمکاؤں گا
گرچہ تھا خلق میں آشوبِ جہاں نام اُس کا　　فتنہ انگیزئ عالم تھا سدا کام اُس کا
پرشہِ امن کے بندے تھے جو بھولے بھالے　　گنبدِ امن میں آرام سے سونے والے
گرم و سرد اُنپہ زمانے کے نہ گزرے تھے کبھی　　گود سے دایۂ راحت کے نہ اُترے تھے کبھی
لایا تھا پیچ میں اپنے نہ کبھی غدر انہیں　　اور نہ تھی سلطنتِ امن کی کچھ قدر انہیں

اُس کی جانب قدمِ شوق بڑھائے سب نے   اور ادب سے سرِ تسلیم جھکائے سب نے
یعنی ہم تابعِ فرماں ہیں جدھر جائیے آپ   جان تک دینے کو حاضر ہیں جو فرمائیے آپ
ان میں یہ کوتہیِ فہم جو پائی اُس نے   مکر کے ہاتھ کو دی اور رسائی اُس نے
پہلے نزدیک اشارے سے بلایا اُن کو   جھک کے پھر کان میں یہ نکتہ سنایا اُن کو
کہ شہِ امن سے ہو شہر نہ خالی جب تک   ملک پائیگا تمہارا نہ بحالی جب تک
اور مدد اس میں تمہاری بھی ہے درکار ضرور   چاہیئے میری رفاقت تمہیں اک بار ضرور
سب نے سینوں پہ رکھے ہاتھ کہ ہم حاضر ہیں   اور جہاں آپ قدم ماریئے دم حاضر ہیں
یہ سخن سنتے ہی اک قہقہہ مارا اُس نے   اور کیا شہر کی جانب کو اشارا اُس نے
ہو ذکر جَست کی اور زینتِ رہوار ہوا   آتشِ فتنہ سے عالم پہ شرر بار ہوا
شہر کی سمت کو رُخ اُس نے دلیرانہ کیا   ایسا للکار کے اک نعرۂ شیرانہ کیا
ہل گئے صدمہ سے جس کے طبقِ خاک تمام   تھرتھرانے لگے نہ گنبدِ افلاک تمام
یہ بلا شورِ قیامت جو نمودار ہوا   دفعتاً چونک کے میں خواب سے بیدار ہوا

کھل گئی آنکھ تو تھی شامِ سیہ فام وہی
وہی آزاد تھا اور کرسیِ آرام وہی

مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف

تھا دلِ آشفتہ جو شب گردشِ ایام سے میں   ہو کے بے خواب اُٹھا بسترِ آرام سے میں
دل تھا حق تلفیوں سے چرخ کی بیزار مرا   اس کے بیداد سے برہم تھا دلِ زار مرا
جاگتے جاگتے وحشت سے جو گھبرایا میں   اور شبِ تار کی تنہائی سے تنگ آیا میں
جیب میں عقل کی کُنجی کو ٹٹولا میں نے   اور کتب خانۂ خیالات کا کھولا میں نے

وہ کتب خانہ کہ جو علم کا گنجینہ تھا — یا کہ رُوداد زمانہ کا اک آئینہ تھا
کتبِ عہدِ قدیم اُس میں سجائی تھیں بہت — عہدِ آیندہ کی تصویریں لگائی تھیں بہت
بہت اوراقِ پریشاں کہ بہم تھے اُن میں — ماضی و حال کے احوال رقم تھے اُن میں
تھے پڑے دفترِ تاریخ کے اخبار بہت — اور نسب ناموں کے پھیلے ہوئے طومار بہت
اُنھیں اوراق میں اک مجھ کو نسب نامہ ملا — کہ عجب مخزنِ اسرار پئے خامہ ملا
سربسر تھے رقم احوالِ نکوفال اُس میں — خاندانِ شہِ انصاف کے تھے حال اُس میں

صدق روشن گہرِ آفاق میں تھا باپ اُس کا — چہرہ پر باپ سے روشن تھا سو آپ اُس کا
تھا نسب اُسکے بزرگوں کا یقیں سے ملتا — حق واقع کا بھی رشتہ تھا یہیں سے ملتا
ہر شرف کا غرض اس گھر سے پتا ملتا تھا — رفتہ رفتہ یونہی ایمان سے جا ملتا تھا

ماں کی جانب میں دیانت کا تو فرزند تھا وہ — اور امانت کے کلیجے کا جگر بند تھا وہ
دانش و داد نے دُود اپنا پلایا تھا اُسے — حسنِ اعمال نے گودوں میں کھلایا تھا اُسے
اُس نے جب ہوش سنبھالا تو بہت شاد ہوئے — ملکِ دل خورمی و عیش سے آباد ہوئے
بعد ازاں مکتبِ تہذیب میں سب لائے اُسے — تا کہ دنیا کی بھی کچھ عقل ذرا آئے اُسے
یاں ادب نے اُسے شائستہ و دلخواہ کیا — علم نے اُس کو ہر اک راز سے آگاہ کیا
کر چکے علم و ادب جبکہ ادا حق اپنا — اور فضیلت نے کیا نائبِ مطلق اپنا
ملک القدس کے دربار میں تب لائے اُسے — کہ معزز کسی اعزاز سے فرمائے اُسے

سرِ دربار بصد حسنِ ادب آیا وہ — ایسے آداب سے تسلیم بجا لایا وہ
کہ شہِ قدس اُسے دیکھ کے خورسند ہوا — اور ہر اک حاضرِ دربار رضا مند ہوا

دونوں اُستاد و اتالیق تھے ہمراہ آگئے   باندھ کر دستِ ادب روبروئے شاہ آگئے
کی یہ پھر عرض کہ تو خسروِ نورانی ہے   اور تجھے عالمِ بالا کی جہانبانی ہے
چاند یہ اوجِ حکومت پہ جو چمکا ہے ترے   ملتجی آج فقط مہرِ کرم کا ہے ترے
اے شہِ قدس رہے تیری نظر حال اس کا   ایسا چمکائیو تو نیّرِ اقبال اس کا
کہ فزوں مہر سے ہو جائے درخشانی میں   حکم ہو اس کا رواں کشورِ انسانی میں

حال یہ علم و ادب نے جو سب اظہار کئے   اور قیافہ نے بیاں اس کے سب اطوار کئے
خسروِ قدس نے تب موردِ اعزاز کیا   خلعتِ عزّت و عظمت سے سرافراز کیا
اپنے اعزازِ دوامی کا دیا تاج اُس کو   اور دعاؤں سے کیا صاحبِ افواج اس کو
مشتری نے دیا عزّت کا عمامہ اپنا   اور عطارد نے دیا ہاتھ سے خامہ اپنا
لقبِ خسروِ انصاف آپ سے ارشاد کیا   اور روانہ سوئے کشورِ ایجاد کیا
کہ ہوا ملکِ فنا ہے جو خرابات تمام   ستم و جور کی ہے چھائی ہوئی رات تمام
جاکے آفاق کو تم نور سے پُر نور کرو   اور خراباتِ جہاں عدل سے معمور کرو

نسخۂ سیرِ خیالی تھا سرِ دست ابھی   اور نظر سلسلۂ شوق سے پابست ابھی
کہ ورق چھوٹ پڑا ہاتھ سے یکبار مرے   نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار مرے
چھائے ایسے یہ تصوّر دلِ بیتاب میں تھے   کہ جو تھے دل میں خیالات وہی خواب میں تھے
اس تصوّر نے غرض میرے اڑایا مجھ کو   دفعتاً ایسے بیابان میں لایا مجھ کو
وہم شاعر کی جہاں بات بھی پہنچے نہ کبھی   وسعتِ فرضِ محالات بھی پہنچے نہ کبھی

یک بیک عدل کے آثار نمودار ہوئے   اور تمام ارض و سما مطلعِ انوار ہوئے

بقعۂ نور کا اک تخت ہوا اور اُترا   کہ جہانداریٔ عالم کو جہاندار اُترا
تھا جلال اُسکے یہ چہرے کی درخشانی میں   چلی جاتی تھی نگہ دیدۂ حیرانی میں
تاب جب تابشِ انصاف کی پائی نہ کہیں   اور ہوئی اُس کی تجلّی کی سمائی نہ کہیں
پردۂ ابرِ کرم سامنے ڈالے اُس نے   مگر اِس پردہ میں وہ رنگ نکالے اُس نے
کہ اک آرام سا آنے لگا بینائی کو   اور ترقی ہوئی ہر دل کی توانائی کو
عالمِ قدس کے سب پاک نہاد آئے وہاں   بند و بست اُنکو جو درکار تھے فرمائے وہاں
جب کہ ساماں ہوئے سب بزمِ شہنشاہی کے   اور ہوئے نظم و نسق ماہ سے تا ماہی کے
توسنۂ عدل ہوا جادہ نما سے عالم   معتدل ہوگئی ہر پھر کے ہوائے عالم
ضعف و قوت بڑھے انداز سے یکساں آگے   اور کھڑی ہوگئی انصاف کی میزاں آگے
رات دن کو یہ ہوا حکم کہ تُل جائیں ابھی   نیک و بد جو ہوں زمانہ میں وہ کُھل جائیں ابھی
یاس و امید کھڑے سامنے مُنہ تکتے تھے   رعب سے شاہ کے پر بات نہ کر سکتے تھے
لی تھی ماں باپ کے وصفوں سے جو تاثیر اُس نے   اور پیا دایۂ دانش کا بھی تھا شیر اُس نے
چہرہ پُر رعبِ خداداد برستا تھا پڑا   حُسنِ خُلق اُس کا مگر پھول سا ہنستا تھا پڑا
تھا لئے ہاتھ میں اک تیغ شرر بار عجیب   اس کے جوہر کا مگر تھا یہ کچھ اسرار عجیب
کاٹ میں بال کا چھوڑے نہ پس و پیش ذرا   اور نہ ہو تول میں تل بھر کا کم و بیش ذرا
دوسرے ہاتھ میں فانوس فروزاں تھا لئے   یا پئے جور و ستم آتش سوزاں تھا لئے
گرچہ فانوس میں تھی اُسکے ہر اک بات نئی   نورِ فانوس میں پر تھی یہ کرامات نئی
یعنی اصلیّت اشیا کو دکھا دیتا تھا   نیک و بد صورتِ آئینہ بتا دیتا تھا

الغرض خسروِ انصاف کا دربار کُھلا   دل پہ عالم کے درِ دولتِ بیدار کُھلا
حق و اثبات حبیب و رحمت وزیر اُسکے ہوئے   ذہن و ادراک و قیاس آکے مشیر اُسکے ہوئے

مصلحت باندھے ہوئے عہد وفا تھی اُس سے ہوتی تدبیر نہ اک آن جُدا تھی اُن سے
پھر اک سمت کو جوں شعلہ بھڑک جاتا تھا رحم پر آپ کرم آ کے چھڑک جاتا تھا
یُمن و اقبال سے نے چمکایا وقارِ دربار اور ہوا عظمت و شوکت پہ مدارِ دربار

کر چکے نظم و نسق آ کے جو سب تیاری تو ہوا پہلے یہ دربار سے فرماں جاری
کہ جو مظلوم ستم دیدہ بیچارے ہوویں اور وہ حق تلفیوں سے ظلم کے مارے ہوویں
بر سرِ وادیٔ انصاف ابھی لائیں اُنہیں تاکہ تحقیق سے ہم داد کو پہنچائیں اُنہیں

شہِ انصاف کو یہ بات جو منظور ہوئی اشتہاروں کی زباں سے وہیں منظور ہوئی
کی پر اُس حکم نے دنیا تہ و بالا گویا بلکہ گھر گھر عجب اک تہلکہ ڈالا گویا
یاس اور آس کے اور شادی و ناشادی کے تھے جو خوف و خطر آبادی و بربادی کے
تو جسے دیکھنی تھی اُس کو لگی تھی اپنی پڑ گئی تھی غرض اک ایک کو اپنی اپنی
تھے جو حق تلفیوں سے لوگ دل افگار تمام آن کی آن میں مظلوم و ستمگار تمام
ہوئے اِس طرح فراہم سرِ میدانِ جہاں ہو گیا حشر کا میدان بیابانِ جہاں

دوسرا حکم ہوا اور وہاں سے جاری اور ہوا خلق میں شہرت کی زباں سے جاری
کہ جُدا ہوویں ہر اک فرقہ کے اشخاص الگ تاکہ احکام میں بھی عام سے ہوں خاص الگ

جب کہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا تو گریبانِ ستم دستِ اجل میں آیا
پہلے اک فرقہ طلب بر سرِ دربار ہوا حکم دربار سے اس طرح اظہار ہوا
کہ جو قبضہ میں ہو حقیت و املاک کوئی نقد یا جنس جہاں ہو تہِ افلاک کوئی

اُس پہ دعوےٰ جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی | اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی
حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوئے دربار بہت | کھلے اسناد و فرامین کے طومار بہت
آلِ تمغا تھے بہ طغرائے سلاطینِ سلف | اور مطلّے و مزیّن تھے بہ آئینِ سلف
بہت اسناد و وثائق کے قبالے آئے | سیکڑوں مہر و شہادت کے حوالے آئے
پر نظر جب شہِ انصاف نے ڈالی اپنی | اور وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی
پھر شہادت کوئی پوچھی نہ گواہی دیکھی | اور نہ مہر و توزک و دفترِ شاہی دیکھی
جو جو اسناد کہ در پیشئ انصاف میں تھے | تھے کھلے یا کہ دھرے گوشہ و اطراف میں تھے
انقلابوں نے زمانہ کے چھپایا تھا اُنہیں | یا کہیں خوفِ جرائم نے دبایا تھا اُنہیں
تھے وہیں زیرِ بغل یا کہ مکانوں میں چھپے | اور مکانوں میں بھی صندوقوں کے خانوں میں چھپے
روشنی پڑتے ہی احوال عیاں ہو گئے سب | جعل کے حرف جہاں تھے وہ دھواں ہو گئے سب
جعلسازوں نے یہ جب دیکھا تو گھبرائے بہم | مکر و تزویر کے پرچے وہیں ڈال گئے بہم
آئی دولت بھی مگر اُس کی رسائی نہ ہوئی | اور سفارش سے وہاں کارروائی نہ ہوئی
طرفہ تر لطف یہ لیکن سرِ دربار ہوئے | کہ یکایک بدل اقبال سے ادبار ہوئے
بے نوا آئے تھے جو وہ امرا ہو گئے سب | جو امیر الامرا تھے وہ گدا ہو گئے سب

الغرض حق کو پہنچ کر جو یہ حقدار آئے | تو وہ انصاف طلب بر سرِ دربار آئے
کہ خطابوں نے بنایا تھا سرِ اعزاز اُنہیں | دینی القاب تھی سرمایۂ اعزاز اُنہیں
ان میں وہ لوگ کہ جو صاحبِ دیدار بھی تھے | تن پہ چمکاتے ہوئے خلعتِ زرتار بھی تھے
خاندانوں کی بزرگی نے بڑھایا تھا اُنہیں | یا کہ دولت کی ہواؤں نے اُڑایا تھا اُنہیں
سب سے پہلے وہ قدم مار کے آئے آگے | عَلَمِ فخر جو لائے تھے بڑھائے آگے
پر جب انصاف نے فانوس اُٹھائی اپنی | چاندنی پرتوِ انصاف نے چھائی اپنی

تو وہ گمنام جو عالم میں سدا خوار رہے
اور کیئے کارنمایاں تو وہ بیکار رہے

اب وہ رُخ پر تو اعزاز سے چمکانے لگے
ان کے سر پر علم اقبال کے لہرانے لگے

پر جو دربار میں آئے تھے سرافرازی سے
اب بھی باز آئے نہ ظالم وہ فسوں سازی سے

لائے تدبیر کو مطلب کی گزارش کے لیئے
چٹھیاں لائے بہت اپنی سفارش کے لیئے

حق کے آگے نہ مگر پیش کوئی بات گئی
اُن کی جو بات تھی آخر وہ خرافات گئی

اُن کے بعد اور اک انبوہ نمودار ہوا
پر عجب شان سے وہ واردِ دربار ہوا

تھے بہت زیرِ کلہ نخوتِ شدّاد لیئے
اور بہت زیرِ بغل خنجرِ بیداد لیئے

سینہ زوری نے اُنہیں سینوں میں تھے زور دیئے
شورہ پشتی نے اُنہیں تھے سر پُر شور دیئے

سیکڑوں بادۂ دولت کے تھے مخمور اُن میں
اور بہت زورِ حکومت سے تھے مغرور اُن میں

بادشاہوں کے بھی دربار میں تھی راہ اُنہیں
اور ہوا خواہ سمجھتا تھا ہر اک شاہ اُنہیں

ظلم گردوں کی طرح چھائی تھی بیداد اُنکی
کسی دربار میں سُنتے نہ تھے فریاد اُن کی

اُن کے مظلوم کہ تھے ظلم کے مارے سارے
عدل کی آس پہ بیٹھے تھے بچارے سارے

جو ستم اُنپہ ہوئے تھے وہ جتا سکتے نہ تھے
لب تلک نالۂ پُر درد کو لا سکتے نہ تھے

پر جو تھا خسروِ انصاف کا دربار یہاں
اور نہ تھا دور رعایت سے سروکار یہاں

یا تو ہر معرکہ میں تھے وہ ستمگار آگے
یاں مگر ہو گئے مظلوم دل افگار آگے

روشنی پڑتے ہی آئینہ ہوئے حال اُنکے
خود بخود کھل گئے سب دفترِ اعمال اُنکے

دستِ ظلم اپنے ستمگار اُٹھا بھی نہ سکے
بلکہ جو ظلم کیئے تھے وہ چھپا بھی نہ سکے

قہر سے کی جو شہِ عدل نے یک بار نگاہ
ہوئی اس طرح سے اُن سب پہ شرربار نگاہ

کہ جو تھے شیر کی کھالوں میں اکڑتے آئے
اور ہوا سے دمِ رفتار جھگڑتے آئے

جامے جل جل کے وہ سب اُنکے سرِ خاک گرے
اور لفافوں سے نکل کر جو وہ بیباک ہوئے

رعب سے خسروِ انصاف کے تھرّانے لگے
سب کے سب صورتِ روباہ نظر آنے لگے

شہِ انصاف نے اُس دم یہ صدا دی سب کو　　اور منادی سے وہیں آکے ندا دی سب کو
کہ جو زیراں سے تھے ابتک وہ دلیر اُنپہ رہیں　　اور مسلّط وہ سدا صورتِ شیر اُن پہ رہیں

لوگ کچھ زمرۂ اعزاز میں واں اور آئے　　پر جو دیکھا تو نظر اُن کے عجب طور آئے
علماؑ و فضلاؑ و بلغا تھے سارے　　اور بھرے سر میں فضیلت کی ہوا تھے سارے
تھے بہت جبّہ و عمامہ شالی رکھتے　　اور بظاہر سے تھے مٹاپے کی بحالی رکھتے
روٹیاں مسجدوں میں کھاتے تھے و نرات پڑے　　مفت خوری میں بسر کرتے تھے اوقات پڑے
سر پہ دستارِ مشیخت کی بہت بھاری تھی　　اور شکم خالی کتابوں کی اک الماری تھی
تھے مگر ایسے بھی اُن میں زدہ احوال بہت　　کہ لکدکوب مشقّت سے تھے پامال بہت
شمع ساں آتشِ تصنیف میں گھُلتے تھے سدا　　پھٹے کاغذ کی طرح خاک میں رُلتے تھے سدا
تھے پڑے بند قلمدان میں ناکامی کے　　اور نکلتے تو ہدف ہوتے تھے بدنامی کے
پر جو نامنصفیٔ دہر نے مارا تھا اُنہیں　　سخت دشوار زمانہ میں گذارہ تھا اُنہیں
غرض انصاف نے جب پرتو اُڈالا اپنا　　رنگ تب معنیٔ اصلی نے نکالا اپنا
مل گئے خاک میں اعزاز جیالی سب کے　　جل گئے خلعتِ زرینہ و شالی سب کے

زمرۂ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے　　زہد و تقویٰ و ارادت سے باخلاص آئے
بسکہ وابستۂ طاعات و عبادات تھے وہ　　خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ
فقر نے مکر کی تصویر بنایا تھا اُنہیں　　خرقہ پوشی نے مرقّع میں سجایا تھا اُنہیں
دیتے جاروب سرِ خاک سے تھے جامے اُنکے　　چھتریاں سر پہ لگاتے تھے عمامے اُن کے
سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے　　عرض حال اپنے وظیفوں میں سناتے آئے
کیا پیری نے تھا روشن رُخِ نورانی کو　　اور نشاں سجدہ کے چمکاتے تھے پیشانی کو

پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں اُنہیں ‏ تا بدربار بھی سو عذر تھے آنے میں اُنہیں
تھے مگر اس پہ بھی اک ایک سے آگے جاتے ‏ اور یہ کہتے سوئے دربار تھے بھاگے جاتے
کہ زمانے کا کوئی لطف نہ پایا ہم نے ‏ اور کچھ آرام نہ دنیا کا اُٹھایا ہم نے
آئے دنیا کے نہ افسون فسانہ میں کبھی ‏ اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانے میں کبھی
تاج سجادہ نشینی کا ہو اعزاز ہمیں ‏ کیجیے تاج کرامت سے سرافراز ہمیں
جب کرامات یہ اک اک نے سنائی اپنی ‏ شہ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی
معرفت قیمع فروزاں سے یک بار آئی ‏ کرتی اصلیتِ اشیا کو نمودار آئی
مکر و تزویر ہوئے اُڑ کے ہوائی سارے ‏ کھل گئے زہد خدائی و ریائی سارے
جو یہ کہتے تھے کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں ‏ بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سنا نام نہیں
یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے ‏ اُن کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں ‏ نان و نفقہ کی طلبگار بچاری دوڑیں
بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا ‏ پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا
علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے آنا چاہا ‏ بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا
سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے ‏ خونِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ اپنے
قتل مضموں تھا زمانہ میں فقط کام اُن کا ‏ نکتہ چینی سے تھا مشہور جہاں نام اُن کا
گرچہ شورش کے قدم آگے بڑھائے ہوئے تھے ‏ رُو سیاہی میں وہ لے مُنہ کو چھپائے ہوئے تھے
الغرض بڑھ کے وہ جس دم سرِ دربار آئے ‏ لوگ اُنہیں دیکھتے ہی جوش میں یک بار آئے
اور یہ چلائے کہ ہے علم سے کیا کام اُنہیں ‏ مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام اُنہیں
کوئی تصنیف ہو ان کی تو دکھا دیویں ذرا ‏ ہو جو تقریر کا دعوےٰ تو سنا دیویں ذرا
سُن کے اِس بات کو اُن کے بھی ہوئے کان کھڑے ‏ سامنے تخت کے گھبرا کے ہوئے آن کھڑے
سو چکا ہوش و حواس اپنے سنبھالے آخر ‏ تھے بغل میں کئی کاغذ وہ نکالے آخر

اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم — پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم مانتے ہم
یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں — اِس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں
ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں — کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں
سُن کے اِس بات کو اک قہقہہ مارا سب نے — اور کہا کاغذوں پر کرکے اشارہ سب نے
کیا خرافات اُٹھا لائے ہو لے جاؤ اُنہیں — اور کبھی بر سرِ دربار نہ پھر لاؤ اُنہیں

لوگ اتنے میں بانبوہ کثیر آئے بہت — اہلِ دربار اُنہیں دیکھ کے گھبرائے بہت
تھے کچھ آپس میں وہ کرتے ہوئے تکرار آتے — غُل مچاتے ہوئے سب تھے سوئے دربار آتے
اہلِ سیف اہلِ قلم شاملِ حال اُن میں تھے — اور بہت تجربہ کار اہلِ کمال اُن میں تھے
اُن کا غُل جبکہ بہت حد سے زیادہ پہنچا — شہ کا تب حکم یہ اک لے کے پیادہ پہنچا
کہ ادبِ شاہ کا اتنا نہ فراموش کرو — کیوں ہو غُل اتنا مچاتے ہو نہیں خاموش کرو
اہلِ سیف آگے بڑھے تیغِ زباں تولے ہوئے — پیشقدمی کے دلائل سے علم کھولے ہوئے
ساتھ ہی اہلِ قلم بولے یہ امکان نہیں — اور یہ آئینِ ادب میں کبھی شایان نہیں
جاہلیت کی حمیت کو نہ یہاں لاؤ تم — علم سے جہل جو بڑھ جائے تو بڑھ جاؤ تم
صاحبِ تجربہ پر اُن میں جو شامل تھے بہت — اور وہ تدبیر مہمات میں کامل تھے بہت
بیچ میں آن کے چلّائے کہ جانے دو نہیں — گر قدم تم سے بڑھاتے ہیں بڑھانے دو نہیں
کہ یہی سر بھی ہیں میداں میں کٹانے والے — ملک کے نام کو سر دے کے بڑھانے والے
کیا ہوا ان سے تمہارے جو قدم پیچھے ہیں — سوئے دربار تم آگے چلو ہم پیچھے ہیں

حکم پھر خسروِ انصاف نے اک اور دیا — اشتہاروں نے وہیں آ کے لُسے دور دیا
یعنی جو لوگ کہ خواہانِ مناصب ہووین — اور لیاقت سے مناصب کے مناسب ہووین

سامنے خسروِ انصاف کے سب آئیں ابھی
اور جو اسناد لیاقت ہوں وہ دکھلائیں ابھی

حکم دربار یہ سُن کر بہت اشخاص چلے
کچھ بصد ناز چلے کچھ بصد اخلاص چلے

اُن میں وہ لوگ کہ تھے دعوئے اعزاز جنہیں
قد و قامت کی وجاہت سے بھی تھے ناز جنہیں

خلعتِ کہنہ بزرگوں کی سجاتے آئے
اور خطاب اُن کی کتابوں سے سُناتے آئے

پردہ دربار میں جب آئے عدالت کے لئے
اور بڑھے لاف و گزاف اُن کی وکالت کے لئے

تو شہِ عدل نے فانوس کو جھکایا ذرا
نورِ تحقیق نے بھی پرتو دکھلایا ذرا

کُھل گئی اُن کی حقیقت تو وہ گھبرا کے ہٹے
اور جو تھے آگے بڑھے پیچھے کو شرما کے ہٹے

خسروِ عدل نے تب غور سے سب کو دیکھا
پہلے اک اک کے حسب اور نسب کو دیکھا

جس قدر اہلِ شرافت نظر آئے اُن میں
اور پھر اوصاف لیاقت کے بھی پائے اُن میں

پاس بلوا کے بہت موردِ اعزاز کیا
اور اُنہیں منصبِ عالی پہ سرافراز کیا

پر اک انبوہ کثیر اُن میں جو ناکام ہوا
کام کا اُس کے بمقصد بہ سرانجام ہوا

شور و فریاد سے کرنے لگا آفت برپا
کیا دربار میں اک شورِ قیامت برپا

ایسے چلّائے کہ میں چونک کے بیدار ہوا
لیکن اس بات سے خوش میرا دلِ زار ہوا

کہ لیاقت سے جو تھے منتخب اشخاص ہوئے
میرے احباب اُن اشخاص میں تھے خاص ہوئے

سامنے پہنچے تھے دشمنِ بدکیش مرے
رہے ناکام سب اعدائے بداندیش مرے

مثنوی موسوم بہ وداعِ انصاف

جب طلوعِ دمِ صبح شبِ تار کا بدلا
اور رنگ چمن میں گُل و گلزار کا بدلا

شبنم نے گُہر فرش کئے خاک کے اوپر
اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر

چلنے کو ہم آنکھ لگے مارنے سارے
اور چاند پہ تاروں کو لگے مارنے سارے

آئی جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں
انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں

لی صبح کے پہلو پہ اُدھر رات نے کروٹ
لی خاک پہ یاں مستِ خرابات نے کروٹ

زاہد جو افیمی کی طرح جھوم رہا تھا
اور بیٹھا مصلّے پہ زمیں چوم رہا تھا

بیدار ہوا سُن کے مؤذّن کی اذاں کو
آزاد جو تھا صرف سخن کر رہا جاں کو

ہشیار ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے
اور وقتِ سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے

تا فیضِ سحر سے ہو دلِ زار شگفتہ
اور ہو کوئی دم جانِ پُر آزار شگفتہ

پر طائرِ دل جب قفسِ شہر سے نکلا
اور قلزمِ افکار کی بیں لہر سے نکلا

دیکھا کہ سوئے دشت ہے دنیا چلی جاتی
اور خلق ہے دوڑی سوئے صحرا چلی جاتی

حیرت ہوئی میرے دلِ بے تاب و تواں کو
اور پوچھا ہر اک شخص سے اِس ازدہاں کو

پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نہ کسی نے
اِس پردۂ حیرت کو اُٹھایا نہ کسی نے

آخر کو نظر عقلِ نظر باز سے لے کر
اور شوق کے بازو پر پرواز سے لے کر

پابند برفتارِ زمانہ ہوا میں بھی
ساتھ اُن کے سوئے دشت روانہ ہوا میں بھی

جب شہر کے میدان سے ہم دُور تر آئے
اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے

دیکھا کہ سرِ راہ کچھ اشجار ہرے ہیں
دامانِ تمنا کو طراوت سے بھرے ہیں

اک شاہ اُسی جا بہ سرِ خاک ہے بیٹھا
بیٹھا ہے مگر سخت غضبناک ہے بیٹھا

اور سامنے باندھے ہوئے ہاتھ کھڑے ہیں
کچھ برہنہ سر اور کہ جو ساتھ کھڑے ہیں

وہ آگے گرے پاؤں پہ با دیدۂ تر ہیں
اور عفوِ جرائم کو جھکائے ہوئے سر ہیں

پر شاہ نے تلوار کو کھولا ہے کمر سے
اور افسرِ شاہی کو بڑھا ڈالا ہے سر سے

دیکھی جو یہ رُوداد تو حیران ہوا میں
جب حد سے سوا دل میں پریشان ہوا میں

اک ایک سے پوچھا کہ ہوا واقعہ کیا ہے
اور شہر میں کیا چل گئی وحشت کی ہوا ہے
وہ ہو رہے سب مضطر و ناچار تھے ایسے
اور اپنی مصیبت میں گرفتار تھے ایسے
آتی تھی کسی میں نہ نظربات کی حالت
تھی بات کی حالت نہ اشارات کی حالت

اک پیرِ کہن اتنے میں نزدیک تر آئے
اور ہوش بھی کچھ اُن کے ٹھکانے نظر آئے
یہ عقدۂ سربستہ رکھا سامنے اُن کے
کھولا یہ معمّے لبِ ناکام سے اُن کے
یعنی کہ ہے یہ شاہ شہنشاہِ مروّت
تھی اس سے زمانہ میں رواں راہِ مروّت
اب اُس نے جو دیکھا کہ ہے رنگ اور یہاں کا
ایمان ٹھکانے نہ رہا اہلِ جہاں کا
دنیا میں ہے بگڑی ہوئی ایک ایک کی نیّت
اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیّت
اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا
اور سلطنتِ خلق سے منہ موڑ کے اپنا
ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو اُن کے
تا اُن کی سزا سونپ کے اعمال کو اُن کے
خود گوشۂ عزلت میں گزارہ کرے اپنا
سر خاک پہ اک اک یہاں مارا کرے اپنا

اتنے میں جو تھے لوگ پس و پیش پریشاں
تھے نیک و بد اُن میں بدلِ خویش پریشاں
سب مل کے فراہم ہوئے اور متصل آئے
ہر چند کہ تھے دل میں بہت منفعل آئے
لیکن تھا ہجوم ایسا بہ کثرت نظر آتا
تھا دل میں تصوّر یہ مرے بیشتر آتا
یا رب یہ زمیں سے ہیں کہ افلاک سے آئے
یا مُردہ نکل کر ہیں تہِ خاک سے آئے

اُس بھیڑ میں آشوب سا اک دفعۃً آیا
یا پانی کا ریلا کہ جو تھا موج زن آیا
جو راس و چپ اُن میں تھے چپ و راس ہوئے سب
میں جن میں کھڑا دور تھا وہ پاس ہوئے سب
پہنچا تھا میں اب فاصلہ پر مدِّ نظر کے
کی جب کہ نظر شوق کے شانوں پہ اُبھر کے

دیکھا ہو استاد ہے سلطانِ مروت — کرتا ہے عیاں حالِ پریشانِ مروت
اب کھولتا ہے تیغ کو ہمت کی کمر سے — اور ہاتھ میں ہے افسرِ شاہی لیا سر سے
گو چشمِ غضبناک سے ہے قہر ٹپکتا — پر لب سے غم و یاس کا ہے زہر ٹپکتا
اور کہتا ہے وہ بادشہِ معدلت اندیش — اک اک سے کہ اے فرقۂ ناعاقبت اندیش
بھیجا ملک القدس نے تھا مجھ کو جہاں میں — تا خلقِ خدا جو ہو زمیں میں کہ زماں میں
ہو وے وہی اُن کا جو ہے دینِ مروت — اور نظم و نسق ہو وے بہ آئینِ مروت
آپس کی رفاقت سے چلیں کام سبھوں کے — نیکی سے ہوں مشہور جہاں نام سبھوں کے
پیدا جو خدا نے ہے کیا کون و مکاں کو — اور عالمِ اسباب بنایا ہے جہاں کو
کام ایک پہ ہے ایک پہ یاں منحصر ایسا — اور اُن میں بہم سلسلہ باندھا ہے پھر ایسا
جس سلسلہ بندی کی جدائی نہ ہو ممکن — اور ہو کے جدا اُکا رروائی نہ ہو ممکن
مل جل کے زمانہ میں گزارے ہوں سبھوں کے — آپس کی مروت پہ سہارے ہوں سبھوں کے
اور سب کو سہارا ہو خداوندِ جہاں کا — اُس بن ہو گزارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

پر یاں تو ہیں سب بادۂ نخوت پیئے بیٹھے — دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لئے بیٹھے
گذری ہوئی گردوں سے ہے گردن کشی اُنکی — اور اُس پہ وہ خود رائی و خود مطلبی اُنکی
نیکی پہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو — اور دیکھ نہیں سکتے زمانہ میں کسی کو
افسوس کہ رُتبہ مرا جانا نہ کسی نے — اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے
لیکن جو زمانہ میں یہی کام ہیں اُن کے — خود دیکھینگے اک دن جو کچھ انجام ہیں اُنکے
ہر چند ہیں آج اہلِ زمانہ مرے دشمن — اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن
پر ہونے دو ان کو جو ہیں سب بر سرِ کیں یہ — جائینگے کہاں بچ کے یہیں ہیں ہوں یہیں یہ

یہ سُن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا — اور اتنے میں اک طرفہ تماشا نظر آیا
دو شخص سرِ معرکہ واں دفعتہً آئے — اور شاہ کے پہلو میں بدرد و محن آئے
سر اپنے جُھکائے ہوئے غمناک تھے دونو — اور درد سے بادیدۂ غمناک تھے دونو
دونو کی وزارت تھی بدربارِ مروّت — اور چلتا انہیں دونو سے تھا کارِ مروّت

اک اُن میں کہ تھا برف نے ڈھالا بدن اُسکا — تھا اُس کا بڑھاپا سفید پیرہن اُس کا
وہ خلقِ خدا میں تھا جو غمخوار سبھی کا — اور آنکھ سے دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا
جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا — اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گُھلا جاتا تھا گویا
وہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اُس کا — تمغائے وزارت پہ رقم نام تھا اُس کا

اک دوسرا شخص اور جو ہمراہ تھا اُس کے — چہرہ پہ برستا حشم و جاہ تھا اُس کے
وہ نسخۂ حیرت بہ نگاہِ عقلا تھا — اور تن پہ جو کی غور تو کندن سے ڈھلا تھا
کچھ توڑے زرِ نقد کے تھے ہاتھ میں اُس کے — صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُسکے
پر ہاتھ میں توڑے جو بھرے دام و درم سے تھے — خالی تھے بہت اُن میں بھرے رہ گئے کم تھے
عالم میں سخاوت سے کرم اُس کا لقب تھا — اور بارِ وزارت وہ اُٹھائے ہوئے سب تھا
دنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے اُس کے — سمجھا یہ مناسب دلِ آگاہ نے اُس کے
ہے بے عملِ خیر کی یاں قدر نہیں ہے — اور دو ولہ بخیلوں کا تہِ چرخِ بریں ہے
ہیں بسکہ بد اندیش پئے خلقِ خدا یہ — دنیا تو جہنم میں گئی دیویں گے کیا یہ
دل سینۂ گندم سے بھی ہے تنگ تر اُن کا — دیتے کو خود دیکھیں تو ہے پھٹتا جگر اُن کا
اب یاں سے چلا شاہِ خوش اقبال ہے اپنا — جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا
دونو وہ غرض باندھ کے دستِ ادب آئے — اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیرِ لب آئے

بے شبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے — یہ ملکِ فنا قابلِ آرام نہیں ہے
افسون و فسانہ پہ یہ دل دادہ ہیں سارے — اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سارے
حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے — اب یہ رہیں گمراہ یہی اُن کی سزا ہے
پر شاہ سے یہ عرض نمک خوار ہیں کرتے — اور مصلحتِ وقت کو اظہار ہیں کرتے
گو اہلِ جہاں پھیرتے ہیں رُخ راہِ وفا سے — اور باندھتے ہیں پیمانِ وفا مکر و دغا سے
پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں — اور جوہرِ اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں
سلطانِ مروّت کو ہیں جو شاہ سمجھتے — اور شاہ کو ہیں سایۂ اللہ سمجھتے
یہ وضع زمانے کی خوشش آئی نہیں اُن کو — ان قدموں سے منظور جُدائی نہیں اُن کو
باقی نہیں دُنیا کی ہوس کوئی رہی ہے — اب اُن کو تمنّا جو رہی ہے تو یہی ہے
ہم یعنی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں — اور بندۂ حق وہ ہے جو ہے بندۂ احساں
جو جو کہ شرف پاتے ہیں اس فیضِ کرم سے — شکر اُن کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے
اک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے — اور جوش جو ہیں جان ہو اخواہ کے اپنے
وہ رنگ میں شکریہ کے اُس آن نکالیں — اور سینوں میں جو کچھ ہیں وہ ارمان نکالیں

جب لب پہ یہ اُن کے سخنِ پُر اثر آئے — اُس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے
گزرے دلِ غمگیں پہ خیالات ہزاروں — اور پیشِ نظر پھر گئے حالات ہزاروں
کچھ بعد تامّل کے مگر اُن سے کہا یہ — اُن کی جو تمنّا ہے تو پھر بات ہے کیا یہ
گو روکتا میرا دلِ مجبور ہے مجھ کو — پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھ کو
دی جبکہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے — شہرت کی مُنادی سے وہیں سُن لیا سب نے
پابندِ مروّت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں — اور جلوہ نما جوہرِ اخلاص تھے اُن میں
ہر سمت سے وہ فرقہ بفرقہ اِدھر آئے — اور شاہ کے شکریئے کو باچشمِ تر آئے

اک فرقہ کا احوال نظر طرفہ تر آیا — وہ سب سے مقدم تھا قدم مار کر آیا
دولت تھی زر و سیم لٹاتی ہوئی آگے — اور دور سے تھی نور اُڑاتی ہوئی آگے
شہرت کی دوامی سے کئے نام تھے روشن — آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن
امیدیں خلائق کی جو تھیں اُن کی طرف تھیں — اور آنکھیں زمانے کی لگیں اُن کی طرف تھیں
تھے اہل جہاں گرد اُمنڈ آئے ہزاروں — اور دامن اُمید تھے پھیلائے ہزاروں
تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ — اور ان سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ
تھے نور بقا شمع جلائے ہوئے آگے — ہاتھوں کے وسیلے سب کے تھے آئے ہوئے آگے
پُر شکل سے ملبوس سے اور طرزِ سخن سے — تھے مختلف الوضع جو وہ اصل وطن سے
ہیں اُن میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا — اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہچان نہ سکتا
وہ فرقہ مگر جب مرے نزدیک تر آیا — اور اُن میں مجھے حاتم طائی نظر آیا
سمجھا کہ سخاوت کے یہ پروردہ ہیں سارے — اور چشم مروت کے نظر کردہ ہیں سارے

بعد اُن کے جو اشخاص کہ آتے نظر آئے — وہ شان و شکوہ اور دکھاتے نظر آئے
تھے دولت و اجلال جلو میں لئے آتے — اور سر پہ ہما اُن کے تھے سایہ کئے آتے
تھے چتر شہی ہو رہے قربان سروں پہ — اور تاج فدا کر رہے تھے جان سروں پہ
پر دخل نہ واں تک تھا ذرا تاج زری کا — افسر تھا سرِ فرق و صفرا ناموری کا
لہراتے ہیں ایک ایک کے سر پر جو علم تھے — اعزاز دوامی کے نشاں اُن پہ رقم تھے
تھے اُن پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے — تا حشر رہیں گے سحر و شام چمکتے
تھے نور سے تمکین و وقار اُن پہ برستے — اور پھولوں سے تھے رنگ بہار اُن پہ برستے
یکساں تھے بحیثیتِ اقبال وہ سارے — پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے

ازِ نہاں دل پہ ہوا جس کا عیاں تھا
کہ رائے نقب اُن میں شبہِ نوشبینہ رواں تھا

میں سمجھا کہ ایسے جو بہ تسکین ہیں آتے
تسلیم عدالت کے سلاطین ہیں آتے

مثنوی موسُوم بہ گنجِ قناعت

مصروف تھا میں سیر میں شب عالمِ جاں کی
اور زیرِ نظر راہ تھی اسرارِ نہاں کی

ہر چند تھا جوں نقشِ قدم خاک کے اوپر
پر خاک پہ تھا میں گئے افلاک کے اوپر

ہردم مجھے گھر بیٹھے زمانے کا سفر تھا
اور پائے تصور سے ہر اک دل میں گزر تھا

کھولے ہوئے دروازہ ہر اک سینہ تھا آگے
جو سینہ تھا گویا کہ اک آئینہ تھا آگے

سینہ میں کبھی جاں میں کبھی اور کبھی دل میں
اور دل سے پہنچتا تھا کبھی آنکھ کے تل میں

روشن صفتِ آئینہ حالات تھے اُن کے
اور جوہرِ آئینہ خیالات تھے اُن کے

ہر منعم و ہر مفلس و ہر شاہ کو دیکھا
ہر مے کش و صوفیِ حق آگاہ کو دیکھا

ہر چند کہ رفتار بہ سیرِ سفری تھی
آنکھوں پہ مگر عقل کی عینک جو دھری تھی

ہر دل میں نظر آتے تھے ارمان ہزاروں
اور اُن میں خیالات پریشان ہزاروں

القصہ ہر اک خانۂ و کاشانہ میں ہو کر
یعنی کہ ہر اک دل کے نہاں خانہ میں ہو کر

جب پائے نظر میں نے رکھا پیشتر اپنا
اک ایسے دلِ پاک میں پایا گزر اپنا

ہر چند کہ تھا تنگ رہ اوضاعِ جہاں سے
وسعت میں تھا کم دیدۂ کوتہ نظراں سے

ہر گوشہ میں بیٹھا تھا لئے کون و مکاں کو
اور آنکھوں میں طے کرتا تھا میدانِ جہاں کو

دیکھا کہ ہے آراستہ اک انجمن اُس جا
اور جلوۂ انوار ہیں پرتو فگن اُس جا
ہر چند کہ دربار تو شاہانہ نہیں تھا
اُس دَور میں جمشید کا پیمانہ نہیں تھا
پر تھا عجب اک نور کا جلوہ کہ نہ پوچھو
اور اُس کا دلوں پر وہ اثر تھا کہ نہ پوچھو

وہ گھر کہ جو سرمایۂ آسودہ دلی تھا
اور کعبۂ دل خلق میں گر تھا تو وہی تھا
واں ڈر کی جگہ دل میں ادب ہوتے تھے پیدا
جو رعب کے ثمرے تھے وہ سب ہوتے تھے پیدا

اک مردِ مقدس جو وہاں صدر نشیں تھا
اور کعبۂ عظمت کے مکاں کا وہ مکیں تھا
عالم میں زن و مرد سے لے پیر و جواں تک
آئے کہ نہ آئے کوئی اُس بزم سے واں تک
تھا صدق سے ہر شخص کے دل میں ادب اُسکا
اور خلق میں تھا خواجۂ قناعت لقب اُس کا

حاضر تھی جو خدمت میں جماعت ندما کی
ہوتی نہ ریاضت کبھی پہلو سے جدا تھی
اخلاق تھے یارانِ قدیمی میں ہمیشہ
اور صبر و توکل تھے ندیمی میں ہمیشہ
ہر چند کہ اک گوشہ میں سجادہ گزیں تھا
پر مسندِ عزت کے لئے صدر نشیں تھا

تھا تاج زری سر پہ نہ سرمایۂ شوکت
اور زیرِ قدم تخت نہ تھا پایۂ شوکت
پر کہتی تھی دولت کہ یہ ہمت کا دھنی ہے
صورت یہی کہتی تھی کہ معنوں کا غنی ہے
تھی اُس کے سراپے سے عیاں شانِ قناعت
اور پاؤں لپیٹے تھے بدامانِ قناعت

تھا بسکہ زمانے سے سروکار نہ اُس کو
دُنیا کی ہوس تھی کوئی زنہار نہ اُس کو
نیت تھی نہ جاتی کبھی مضمونِ طلب تک
اور تھی نہ ہوس دل میں جو آتی کبھی لب تک

تھی چشمِ تمنا نہ کسی چیز پہ اس کی   آنکھوں سے ابھرتی تھی نہ باہر نظر اسکی

وہ شمع صفت گرچہ سرِ بزم تھا بیٹھا   اور عزمِ ہدایت پہ بصد جزم تھا بیٹھا
پر دل جو بھرا تھا ہوسِ ملکِ فنا سے   اور رخ تھا بچائے ہوئے دنیا کی ہوا سے
نور اس کا تو آفاقِ جہاں گھیرے ہوئے تھا   جس رخ سے مگر دیکھئے منہ پھیرے ہوئے تھا

جو لوگ وہاں اہلِ طریقت سے تھے آتے   سب اہلِ یقیں دل کی عقیدت سے تھے آتے
ملتی تھی جنہیں کچھ خبر اس رازِ نہاں سے   اک عینک انہیں ایسی عطا ہوتی تھی واں سے
جو دل کے لئے رابطۂ روشن گھڑی تھی   اور بہرِ نگہ سیڑھیِ عالی نظری تھی

جوہر یہ کرامات کے تھے اسکے اثر میں   کر دیتی تھی ہر چیز کو ناچیز نظر میں
یا دور کے مقصد کو تھی نزدیک لے آتی   اور سامنے اس طرح سے تھی جھلک لے آتی
موجود کبھی ہوتے تھے مقصود نظر میں   یکساں تھے کبھی بود یہ نابود نظر میں

تھا جلوۂ رخ سامنے اس مردِ خدا کا   جو دفعتۃً اک آ گیا جھونکا سا ہوا کا
قدرت کا تماشا وہ دکھاتا ہوا آیا   اک پرچۂ اخبار اڑاتا ہوا آیا
قاصد کی طرح آن کے قالب میں صبا کے   رکھا بہ ادب سامنے اس مردِ خدا کے

وہ نامہ دیا پیکِ صبا نے جو ہمیں لا کر   دیکھا اسے تب خواجہ قناعت نے اٹھا کر
طوفانِ طمع میں جو پڑی خلقِ خدا تھی   اور چلتی زمانے میں ہوس کی جو ہوا تھی
تھے اس میں بہ تفصیل وہ احوال سراسر   اور تھے رقم ایک ایک کے احوال سراسر

اُس رقعہ پہ جب خواجۂ قناعت نے نظر کی — اور دیکھی یہ روداد بنی نوع بشر کی
آزردہ ہوا درد و حمیّت کے سبب سے — مُنہ پھیر لیا ہو کے وہیں چپ اک بار غضب سے
اِس طرح سے گرجا کہ ہو جوں ابر گرجتا — یا شیر کہ ہو درد سے بے صبر گرجتا
معلوم ہوا تھا جو کچھ اخبار میں اُس کو — بھیجا ملک القدس کے دربار میں اُس کو
پر لوگوں کی نیت تھی جو دیکھی ہوئی اُس نے — اس واسطے آیا آپ بھی عرضی لکھی اُس نے
تحریر کئے اُس میں جو تھے حال یہاں کے — اور جن میں تھے آلودہ بداعمال یہاں کے
لکھا کہ ہے عالم میں عمل بوالہوسی کا — ایمان ٹھکانے نہیں دنیا میں کسی کا
دیتے مری نیکی کا بدی ہیں صلہ مجھ کو — اور کہتے ہیں بے ہمّت و بے حوصلہ مجھ کو
ہے ان کو ہوس طوق پہ گردن کے پھرتی — کتّے کی طرح سب کو ہے در در لئے پھرتی
آنکھوں پہ لیا سر پہ جو آیا کوئی ٹکڑا — پر صبر و قناعت کا نہ پایا کوئی ٹکڑا
ہیں خواری و زاری کے لئے سارے حق اُس کے — اے کاش قناعت کا بھی لیتے سبق اُس سے

ایسے بھی ہیں اکثر کہ ہیں افلاس سے مرتے — دن رات پڑے ہیں الم و یاس سے مرتے
محنت سے جو برگشتہ ہے نیت ہوئی اُنکی — اور حد سے ہے گذری ہوئی بے ہمتی اُنکی
ہیں خانۂ ہستی میں وہ مکڑی کا نمونہ — تن ہو گئے ہیں سوکھ کے لکڑی کا نمونہ
تنتے ہیں خیالوں کے سدا تار گھروں میں — دن رات پڑے رہتے ہیں بیکار گھروں میں
جب دیکھو اپاہج کی طرح خوار ہیں گویا — جیتے ہوئے ایسے ہیں کہ مُردار ہیں گویا

اور ایسے بھی کچھ ننگِ خلائق ہیں جہاں میں — جو تن کو لئے بیٹھے ہیں راحت کی اماں میں
پر دل میں سدا کام سے ہیں جان چُراتے — اور جان کے پردہ میں ہیں ایمان چُراتے

ب رنگ فقیری کا جمائے ہوئے بیٹھے — اور دام وغا اُس میں لگائے ہوئے بیٹھے
وہ تارکِ دنیا نہیں عقبیٰ کی غرض سے — دُنیا کو ہیں چھوڑے ہوئے دنیا کی غرض سے
ظاہر ہیں فقط زہد کی تصویر ہیں گویا — دل دیکھو تو شیطان کے بھی پیر ہیں گویا
ہے چاٹ زباں کو جو لگی مُفت خوری کی — پروا ہے اب ان کو نہ بھلی کی نہ بُری کی
جو ہو نہ کرنا یہ بد انجام ہیں کرتے — اور نام مرا مُفت میں بدنام ہیں کرتے

حالاتِ جہاں سارے کئے جب رقم اُس نے — تب کی یہ رقم مہرِ زبانِ قلم اُس نے
یعنی مجھے رہنا یہاں منظور نہیں ہے — اور آپ کا دربار بھی کچھ دُور نہیں ہے
بلوائیں تو بندہ ابھی اک آن میں آئے — واں آؤں تو پھر جان مری جان میں آئے
یہ حال میں اپنے ہیں ہوں گرفتارِ ہمیشہ — خواری میں جو خوش ہیں تو رہیں خوار ہمیشہ

دیکھا ملکُ القدس نے حالِ اہلِ جہاں کا — اور حال کھلا اُن کے ہر اک رازِ نہاں کا
فرمایا اسی وقت کہ دربار ہو قائم — اور اُس میں اک آئینۂ اسرار ہو قائم
مخلوق کہ ہیں خاص سے تا عام جہاں میں — جاری ہوں اسی دم اُنہیں احکام جہاں میں
تا جملہ زن و مرد سے لے پیر و جواں تک — ہیں ہو چکے آفاق میں اور ہونگے جہاں تک
وہ آکے حقیقت سرِ دربار دکھائیں — اور یاں انہیں آئینۂ اسرار دکھائیں
تا جوہرِ اصلی جو ہر اک دل میں نہاں ہوں — آئینہ میں وہ صورتِ آئینہ عیاں ہوں

جس دم یہ دیا حکم جہاندار جہاں نے — مشہور کیا خلق میں شہرت کی زباں نے
یاں سُنتے ہی کُل خاص سے تا عام تھے جتنے — ارواح سے تا عالمِ اجسام تھے جتنے
جو جو کہ تھی مخلوقِ خدا نیک سے بد تک — اور ہو چکے یا ہونگے ازل تا بہ ابد تک

تحفے لئے ہاتھوں میں دل و جاں کے حاضر دربار مقدس میں ہوئے آن کے حاضر

بیٹھا ملک القدس یہ اورنگ عدالت چھایا ہوا آفاق میں تھا رنگ عدالت
آئینہ کہ جوں شیشۂ افلاک تھا روشن یا اہلِ صفا کا وہ دلِ پاک تھا روشن
پرتو فگن اس میں تھے جو انوارِ حقیقت کھلتے تھے پڑے خلق کے اسرارِ حقیقت

دربار میں یک بار منادی نے ندا دی اور گوشِ عقیدت میں وہیں سب کو سنا دی
یعنی کہ بہ ترتیب ہر اک فرقہ جدا ہو اور سامنے آئینہ کے حاضر بصفا ہو
دنیا میں کسوٹی ہے وہ ہر کھوٹے کھرے کی اور دیتا ہے خبر ہے تہ دل سے بھی پرے کی
جس شخص کی تصویر کہ اس میں اتر آئے باطن کی جو حالت ہے وہ ظاہر نظر آئے

اک فرقہ یکا یک ہوا دربار میں حاضر اور پہلے ہوا معرضِ اظہار میں حاضر
خوشحال بھی تھے اور زدہ احوال بھی انمیں تھے حادثۂ دہر کے پامال بھی ان میں
پر ہاتھ لگائے تھا وقار ان کے سروں پر دولت کھڑی ہوتی تھی نثار ان کے سروں پر
بھوکے بھی جو تھے ان میں جو جی سیر تھے انکے آہو شکمی نے کئے دل شیر تھے ان کے
خالی نہ تھی سبب سے نہ یہ آہو شکمی بھی اک بات میں تھی ان کو قناعت کی کمی بھی
یعنی کہ بظاہر تھے شکم وصل کمر میں جس سے کہ سبک تھے کس و ناکس کی نظر میں
بھوکے تھے مگر فضل و کمالات کے سارے محتاج اگر تھے تو اسی بات کے سارے

دیکھے ملک القدس نے جب حال سبھوں کے آئینہ ہوئے جوہر اعمال سبھوں کے
اعزاز دوامی کے دئے تاج بھی ان کو اور ملک قناعت کے دئے باج بھی انکو

تا اہل جہاں میں رہیں ممتاز ہمیشہ	اور رہویں زمانہ میں بہ اعزاز ہمیشہ

بعد اُس کے گروہ اور اک آتا نظر آیا	اور اُس میں تماشا یہ نظر طرفہ تر آیا
آئے بہوس سب سے قدم مار کے آگے	پر پہنچے جب آئینۂ اسرار کے آگے
سرتا بقدم عکس ہوئے جلوہ گر اُس میں	اِس طرح کے آئے وہ نظر جانور اُس میں
جن کے بدنوں پر نہ دہن تھے نہ گلے تھے	کھانے کے لئے سارے تن شکم ہو کے ڈھلے تھے
ملتی تھی نہ وہ شے کہ قناعت کریں جس پر	مانند مگس تھے کبھی اُس پر کبھی اِس پر
تھے خواری و رسوائی میں دن کاٹتے پھرتے	اور ہونٹ تھے مکھی کی طرح چاٹتے پھرتے
پر دولۂ حرص نہ ہوتے تھے کم اُن کے	غربال کی صورت تھے نہ بھرتے تھے شکم اُن کے

کچھ لوگ عجب رنگ دکھاتے ہوئے آئے	اور اپنے تماشے پہ ہنساتے ہوئے آئے
راحت طلبی اُن کو گرانبار تھی کرتی	اور زندگی اس طرح سے مردار تھی کرتی
ہل کر انہیں جانا تھا کہیں گور کا جانا	یا قید مشقت کی طرف چور کا جانا
آنے میں بھی تھے جان چُرائے ہوئے آتے	لوگ اُن کو تھے کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے آتے
القصہ وہ جب بیچ میں دربار کے آئے	اور سامنے آئینۂ اسرار کے آئے
تھے سانڈ کہ سر ڈال کے ناچار کھڑے تھے	اور کرتے جُگالی سرِ دربار کھڑے تھے

اور ٹٹّے کے اوجھل میں جو عیّار تھے بیٹھے	دن رات شکاروں کے طلبگار تھے بیٹھے
پردہ میں قناعت کے وہ تھے تیر لگاتے	اور دام و دغا تھے پسِ نخچیر لگاتے
ظاہر میں بڑی تمکنت و شان سے آئے	لیکن نظر آئینہ میں شیطان سے آئے
روباہ کی صورت نظر آتے تھے وہ سارے	گرگٹ کے مگر رنگ دکھاتے تھے وہ سارے

جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے — آئینۂ حالات و خیالاتِ جہاں تھے
اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو — حیراں ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

پنہاں کہیں سینے کے کیوں پھرے ایک ایک کے گھر تو — اپنے ہی چپ و راست ذرا غور تو کر تو
پہلو میں کہیں تیرے نہ وہ خانۂ دل ہو — آزادہ وہ اپنا ہی نہ کاشانۂ دل ہو

مثنوی مسمّیٰ بہ ابرِ کرم

جو نکتہ یاب ہیں کتبِ انقلاب کے — دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے
دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا — جو آگے آئنہ ہے دکھاتا مثال کا
شاہانِ ماسلف کے مرقع عجیب ہیں — روشن سب اُس میں عہد بعید و قریب ہیں
تحریر تازہ لاتی ہے نقشہ ہر سامنے — آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
اِس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے — دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے
قانونِ انقلاب یہاں رسم و راہ ہے — موسم بہ موسم اس میں نیا بادشاہ ہے
اب یاں جو چند روز سے قانون عام ہے — گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے
عالم تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا — اک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا
منہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی — اور گرد چار سُو تہِ افلاک اُڑ رہی
دنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی — پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے — اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے
طفلِ نباتات پیاس کے مارے بلک گئے — خلقِ خدا کے نالے بہت دور تک گئے

تاب ہو کے سینہ سے ہر دل نکل چلا — اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا
ل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے — انساں تڑپ کے ماہیٔ بے آب ہو گئے
پر اب ہے دَور دَورِ شہِ برشکال کا — چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا
گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا — اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا
فرمانِ راحتِ سحر و شام آ گیا — خلقِ خدا کی جان کو آرام آ گیا

اے ابر آکہ تُو تو شہِ برشکال ہے — جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اَور — تیری زمیں ہے اَور ترا آسماں ہے اَور
نوروزِ آب و رنگِ بہارِ جہان ہے — تو نو بہارِ کشورِ ہندوستان ہے

اے ابر جوشِ سبزہ و گلشن نہیں ہے یہ — پھولوں نہیں سماتی خوشی سے زمیں ہے یہ
مدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو — آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو
آنے سے تیرے آ گیا آنکھوں میں نور ہے — دیوار و در سے آج برستا سرور ہے
تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے — سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

ہر قطرہ تیرا قطرہ ہے آبِ حیات کا — پاتا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا
تو دودھ ہے نبات کے اطفال کے لئے — اور زندگی درختِ کہن سال کے لئے
اے ابر زور کیا کہوں میں تیرے ثیر کے — دانہ پہاڑ کو ہے نکل آتا چیر کے
سب تجھ سے نونہال چمن سبز بخت ہیں — اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں
یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے — ہیں حوصلے بہار کے باہر نکل پڑے

گہ پیرہنِ سبز اُڑھاتا زمیں کو ہے — پھولوں سے گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے
گردوں پہ کرتا عالمِ نیرنگ ہے کبھی — دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی
سیماب صبح میں کبھی شنگرف کا گھولنا — اور وہ نگار خانۂ چینی کا کھولنا
لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے — کرتا فلک کو بادلوں سے دگلہ پوش ہے
یوں رنگ دمبدم جو بدلتا جہاں کے ہے — اے ابر سیکھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ اوج کے — دَل بادل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے دیوزاد کی صورت بنائے تُو — اور بال و پر سمند کے ہے اُڑتا لگائے تُو
اُس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب — اے ابر تیرے ساتھ یہ دمساز ہے غضب
بل بے تری گرج کہ دلِ زار ہل گئے — ہیبت سے رعد و برق کی کہسار ہل گئے
لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں آ رہیں — اور ٹھینیوں کے سازوں پہ سُر ہیں ملا رہیں
کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا — اور میٹھی بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا
اے ابر سب یہ ساز و نوا تیرے دم سے ہیں — یہ لطفِ عیش و لطفِ ہوا تیرے دم سے ہیں

غنچوں کے مارے پیاس کے تھے مُنہ کھلے ہوئے — گُلشن کے نونہالوں کے منکے ڈھلے ہوئے
انسان پھرتے پیاس سے تھے بدحواس سے — مُنہ کھولے تھے کبوتر و کنجشک پیاس سے
رونق سبھوں کے مُنہ پہ ہے اس آن آ گئی — آنے سے تیرے جان میں ہے جان آ گئی

تیرا خطاب رحمتِ پروردگار ہے — خلقِ خدا کے رزق کا تُو ذمہ دار ہے
سرمایہ تُو ہی دیتا ہے تجار کے لئے — اور سایۂ ہما ہے زمیندار کے لئے

اے ابر وہ جو خلق میں دہقانِ پیر ہیں عمریں ہوئیں لکیر پہ بیٹھے فقیر ہیں
اُن کو امید تھی۔ نہ کسی کی پناہ تھی تجھ پر نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی
آج اپنے رنج و فکر سے اُن کو فراغ ہیں ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

کچھ فیض اور ہے
اے ابر تیرے فیض کا ہر جا وفور ہے پر کوہ و کوہسار میں کچھ اور فیض ہے
ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے اور گلبنوں سے لیکے شجر تک ہرے کھڑے
چشمے ہیں جا بجا تری رحمت کے بہ رہے گویا زبانِ موج سے ہیں وصف کہہ رہے

ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا
اب پوچھتا فلک سے ہے مقدار اوج کی دیکھو میں آیا توڑ کے زنجیریں موج کی
دیوانہ وار کف بہ لبِ آب مارتا گاہے تھپیڑے ہے گہے گرداب مارتا
یہ جوش یہ خروش سما ہے دکھا رہا ہر موج میں ہے نوح کا طوفان اُٹھا رہا

پر مجھ کو رشک ہے اُسی مستِ مدام پر جس کی کہ مستی نہیں موقوف جام پر
مستانہ پن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی مستانے ساتھ رکھتا ہے وہ چار اور بھی
سبزہ پہ لوٹتا ہے وہ باغ آسماں پہ ہے اور وہ مبدم یہ مطلع موزوں زباں پہ ہے
یوں پھوٹ کر جو ہیں گل و ریحاں نکل پڑے کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

اس وقت تو چھایا ہوا ہے جہان پر چھایا ہوا سما ہے زمین آسمان پر
چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر اور اُٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

آئی ادھر صبا ہے اُدھر سے نسیم بھی اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آئی شمیم بھی
مستی میں جھومتا وہ جوانانِ باغ کا جھک جھک کے لیتا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
سبزے کے عکس سے ہے در و دیوار سبز سبز سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز
اِن سبز سبز کیاریوں پر دل ہیں لوٹتے طوطی برنگِ طائرِ بسمل ہیں لوٹتے
شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی موتی بکھیرتی ہے جواہر لٹا رہی
سبزے کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے شاخ و شجر تمام مرصع کھڑے ہوئے
پتوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں
شبنم کا جوش گر یہی طوفاں اٹھائے گا ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائے گا
لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آ گئے اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے
کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے برسیگا آج خوب دھواں دھار ابر ہے
آیا اُمنڈ گھمنڈ کے عجب دھوندوکار ہے نو دن کی گر لگا دے جھڑی تو بہار ہے
لیکن یہ باجرا سا برسنا پھوار کا ہے گا پیام ابرِ بہاری کے تار کا
بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ہیں ڈھلک رہے وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے
آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا اور روئے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں
کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھنگولنا
طاؤس کا وہ دُم کو چنور کر کے ناچنا اور مورنی کا اشک کے موتی کو جا چگنا
لیکن چمن سے ناچ کے چلنا جو مور ہے اک قہقہہ یہ طنز لگاتا چکور ہے

املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا — اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے — اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں — پردیسیوں کی یادوں سے ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے — بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں — لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں
کیا کیا بیاں کروں میں تری رات کا مزا — گر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزا
سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا — چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے — کرتی نقابِ ابر میں چشمک ہے ناز سے
اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے — نالہ کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے
کوٹھے یہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں — ہے فخرِ گُل کو آوے اگر پائے بوس میں
آنا وہ بھینی بھینی ہوا کا کبھی کبھی — بول اٹھنا مرغِ نغمہ سرا کا کبھی کبھی
آرام کہہ رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو — قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو
آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی — اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

طولِ امل کو اپنے اب انجام دیجئے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجئے

مثنوی زمستان

اے زمستاں کہ ہے تو بادشہِ برفانی — شاہ برفانی و شاہنشہِ برفستانی
تختِ اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا — اور ہے دربارِ سرِ کوہ ہمالا تیرا

شرق تا غرب نرا ملک ہے کہ طرف سفید
اڑ رہا پرچم اقبال ہے جوں برف سفید

جبکہ عالم پہ ہے تو لشکر جنگی لاتا
کوہ و صحرا کو برابر ہے اُلٹتا آتا

باد صرصر ہے نشاں تیرا اُڑاتی آتی
فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی

طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیر جہاں
تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیر جہاں

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھونکا جاتا
مارے ہیبت کے ہے دل سینوں میں ٹھہرا جاتا

ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے
پرزے پرزے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے

باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھونکا آتا
ڈر کے ہر برگ ہے پیوند زمیں ہو جاتا

تیرے سنّاٹے سے ہوتی ہے ہوا جان نبات
خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلان نبات

تھرتھراتے ہیں کھڑے سامنے جوانانِ چمن
منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحانِ چمن

ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اُڑاتے سارے
گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے

نغمہ سنجانِ چمن پر ہیں پھلائے بیٹھے
اور پر و بال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے

باغباں کا جو گلستاں میں گزر ہوتا ہے
لبِ حیرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے

یا الٰہی وہ جوانانِ چمن ہو گئے کیا
باغ سنسان ہے مرغانِ چمن ہو گئے کیا

رازِ غم کس سے کھلے باغ میں بلبل بھی نہیں
کان میں پوچھے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں

نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے
نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے

کہ درختانِ چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں
ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیراں کیوں ہیں

اے زمستاں جو ہوئی خامہ سے ہے بوالعجبی
فی الحقیقت ہوئی خدمت میں تری بے ادبی

تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی
دفعِ زہرِ حشرات کی ہے آفت ہوتی

خلق سے دفع وباؤں کی بلا ہوتی ہے
اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے

خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے
پاتا ہر میوۂ شیریں ہے عذوبت تجھ سے

تو نے ہے صاف جہاں قاف سے تا قاف کیا
شیشۂ گنبدِ فیروزہ سے ہے شفاف کیا

مل وقاقم و سنجاب سہاتا تو ہے بہت اثمارِ تر و خشک کھلاتا تو ہے
تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا تھا نہ کھانے ہی کا کچھ اور نہ پینے کا مزا
اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا اور بغل سے دلِ وحشت زدہ نکلا جاتا
یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے آگ ہاتھ آئے تو ہیں دل میں چھپائے لیتے
مارے سردی کے جگر سینوں میں تھرائے رہے بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھے بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے
کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں
کہیں سو سو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی ہے گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے
حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے قالی کے
اسکی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے
تعلی سے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی تن تو ٹھنڈے ہیں پر سینوں میں ہے آگ لگی
ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں دل میں ہے آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں

تیرے افضالِ سخاوت تہِ افلاک ہیں عام ملتی سب اہل جہاں کیلئے پوشاک ہے عام
اہل دولت کو ہیں خلعت میں دوشالے ہوتے غربا سارے ہیں کمبل کے حوالے ہوتے
کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی دوشال میں مست
جان عالم ہیں الگ بسترِ مخمل میں پڑے فقرا لپٹے ہیں سب ایک ہی کمبل میں پڑے

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف　　تیری شبہائے دراز اور وہ ہر بات کا لطف
کی تری رات سے نے داناؤں کی ہے بات بڑی　　کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی
ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا　　اور جو بچہ ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا
بزم احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے　　ساز عشرت کے لئے برگ و نوا ہے تجھ سے
شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا　　پان کھانے کا گاوری کے چبانے کا مزا
یار حقے کے ترے دَور میں لیتے ہیں مزے　　دُود تلخ اُسکے سوا دُود سے دیتے ہیں مزے
گھونٹ حقے کا یہ ہر دم نہیں ہم بھرتے ہیں　　اے زمستاں یہ ترے عشق کے دم بھرتے ہیں
صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے　　مایۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے
ہر طرف ہے گی پیالی پہ پیالی اُڑتی　　مے نہو وے تو ہے تصویر خیالی اُڑتی
بے نشے مست پڑے شکر خدا کرتے ہیں　　چائیں پی پی کے ترے سر کو دُعا کرتے ہیں

شب سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا　　تو اسی شب سے ہے مزا مجلس خاموشی کا
ہیں کبھی عالم ارواح کے مہماں آتے　　بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے
دل کے ایوان میں ہیں وہ آکے عدالت کرتے　　ہیں کتابوں کے وکیل اُن کی وکالت کرتے

جلوہ گر پیش نظر ہوتی ہے فانوس خیال　　پھرتے ہیں چار طرف دوڑتے جاسوس خیال
بیٹھا جمشید کہیں دیکھتا ہے جام اپنا　　پر سمجھ میں نہیں آتا ہے کچھ انجام اپنا
دوش ضحاک پہ آتے ہیں کبھی مار نظر　　سر ضحاک سے ہے آتا بہ سر دار نظر
گرز کو دوش پہ رستم ہے اٹھائے جاتا　　ہفتخواں میں ہے کبھی رخش اُڑائے جاتا
کبھی سہراب سر خاک نظر آتا ہے　　باپ بھی غم سے جگر چاک نظر آتا ہے
کہیں دربار سکندر کہیں بزم دارا　　اور کہیں عزم سکندر رہے بہ رزم دارا

ن دارا ہے کہیں بے سر و افسر ہوتا
اور سرہانے ہے کھڑا اُسکے سکندر روتا

خضر کے ساتھ سکندر کہیں ظلمات میں ہے
کبھی نوشابہ سے مصروف ملاقات میں ہے

ژند و پاژند کو زرتشت سناتا ہے کبھی
شعلہ در آب میں آتش کو دکھاتا ہے کبھی

کبھی محمود ہے چڑھ کر سرِ جے پال آتا
کشورِ ہند میں گویا کہ ہے بھونچال آتا

نقشہ نعمان خورنق کا جماتا ہے کبھی
سنّمار اپنے کٹے ہاتھ دکھاتا ہے کبھی

گاہ چنگیز ہے اور گاہ ہلاکو آتا
جیسے گھر لوٹتا ہو دے کوئی ڈاکو آتا

جب بہت طول پکڑتی ہے شبِ دیجوری
لیکے تیمور ہے آتا تزکِ تیموری

ہند سے گرچہ بہت جلد چلا جاتا ہے
پشت در پشت مگر سکہ جما جاتا ہے

بزمِ افسانہ میں واں خسرو پرویز بھی ہے
باربد زمزمہ سے اپنے شکر ریز بھی ہے

قصرِ شیریں سے ہے فرہاد بھی دلگیر آتا
پر بغل میں لئے شیریں کی ہے تصویر آتا

خونِ فرہاد سے تیشہ سے ہے کھلاتا لالہ
چادر اوڑھے ہے کھڑی پیرزنِ دلالہ

ہیں یہاں انجمنِ علم کے جو صاحب راز
فصلِ سرما میں ہیں جب دیکھتے شبہائے دراز

خانہ مُول میں وہ اک بزم ہیں قائم کرتے
منعقد مجلسِ اربابِ عمائم کرتے

فخر رازی کبھی لے آتے ہیں تفسیر کبیر
بوعلی آکے سناتے ہیں شفا کی تقریر

ہوتی ہیئت کی مجسطی سے ہے توضیح وہاں
کبھی ہوتی ہے سطرلاب کی تسطیح وہاں

ہے کوئی جلد دلائل کو مجزّے کرتا
کوئی ابطال جزِ لایتجزّے کرتا

ہے دلائل سے خلا کو کوئی باطل کرتا
پر ہے دانائے فرنگ اسکو بھی قائل کرتا

دفعۃً چلتی ہے مجلس پہ ہوائے یوناں
یعنی تشریف ہیں لاتے حکمائے یوناں

ہے فلاطوں لئے اشراق کے آئینہ کو
کرتا آئینہ سے ہے صاف سواسینہ کو

پر ارسطو جو کبھی بزم میں آ جاتا ہے
باتوں ہی باتوں میں ہر مشکل مٹا جاتا ہے

رکھتے ہیں جو کہ طبیعت میں ہوائے چمنی   چلتی ہے انکی طبیعت پہ ہوائے چمنی
آکے سودا کبھی اک ہجو سنا دیتے ہیں   لیکن اس طرح کہ محفل کو لٹا دیتے ہیں
پھر کبھی پڑھ کے سناتے ہیں قصیدہ اپنا   میر پڑھتے ہیں کوئی شعر گزیدہ اپنا
ناسخ و آتش و انشاؔ و نصیر آتے ہیں   غالب و ذوق مگر خاتمہ کر جاتے ہیں

ہوتی ہے اتنے میں ہے افلاک پہ تنویر سحر   ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصائے پیر سحر
سر پہ اپنے وہ بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید   ریش پُر نور میں ہے جادہ نہاروے سفید
شجرِ طور کا عالم ہے بناتا آتا   ساتھ ہے کوہ ہمالہ کو اٹھاتا لاتا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے   ملک تاتار کی تصویر دکھا دیتا ہے

گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور   اے زمستاں ترے اس ملک میں آئین ہیں اور
ایک جھونکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے   تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت ہے کہسار تلک   کوہ سے تابہ تلک باغ سے اشجار تلک
واں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت   زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے   آب زر روئے نباتات پہ پھیرا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا   پتے پتے کو جلاتا ہوا ایک لخت آتا
دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے   جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
ہر شجر پہ ہے غرض رنگ بدل کر آتا   کہیں زرکار ہے آتا کہیں مسکر آتا

پر ترے حکم کے جھونکے میں سوا تیزی ہے   کہ نباتات پہ طوفان بلاریزی ہے

اب دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سرِ خاک پڑے
اور شجر سب ہیں برہنہ تہِ افلاک کھڑے

تہ پیرِ سحر سانس سے بھرتا ایسا
یا زمانہ پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا

کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یکبار سفید
دشت و کہسار سے تا در و دیوار سفید

ابر کی طرح بخارات کا گِھر کر آنا
برف کے پردہ میں وہ روئی دُھنکتے جانا

ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اُڑتے
اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اُڑتے

جابجا آبِ رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے
اور سرِ چشمہ میں شیشے کی طرح جم جاتے

جو شجر گلشنِ ہستی میں برہنہ تھے کھڑے
یا کہ پتوں کا بڑھاتے ہوئے گہنا تھے کھڑے

شجرِ نور سرِ طور نظر آتے ہیں
سربسر غیرتِ بلور نظر آتے ہیں

ہیں زمستاں ترے سب کام زمانہ سے الگ
یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ

جامِ گردوں میں ہے تو شیر جماتا کیونکر
اور ہوا میں ہے تپاشیر اُڑاتا کیونکر

ابرِ باراں تو تہِ چرخِ بریں دیکھا تھا
پر برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

جبکہ ہوتا ہے گزر جانبِ کہسار ترا
فنِ صنعت سے وہاں اور کچھ اسے یار ترا

بُت تراشی میں ہے تو غیرتِ فرہاد وہاں
قصرِ شیریں کی ہے تو ڈالتا بنیاد وہاں

اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا
صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا

پتے پتے کا ہے تصویر میں انداز درست
اور ہر اک میوہ ہے قدرت سے خدا ساز درست

اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے وہیں
برف کا اسپِ سبک خیز بھی ہوتا ہے وہیں

ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی
اور پری ہے پرِ پرواز سے تیار کھڑی

چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کر جاتا ہوں
اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں

برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا
اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اٹھائے بیٹھا

شیر وابستۂ زنجیر بنا تا ہے وہیں — اور کبھی فیل کی تصویر بنا تا ہے وہیں
کبھی انساں کبھی حیوان بنا دیتا ہے — اور کبھی صورتِ شیطان بنا دیتا ہے

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تو — تو کبھی رشکِ دو مانی و بہزاد ہے تو
برف سے جب ہے نکھرتا فلکِ زنگاری — اور تری طبع ہے آتی سوئے رنگیں کاری
کسی صیاد کو ہے کر کے ضیافت لاتا — اور کوئی صید ہے سرگشتۂ آفت لاتا
لیتا پھر کارِ قلم ہے دمِ شمشیر سے تو — اور ہے شنگرف کو لیتا رگِ نخچیر سے تو
کی سرِ خاک جو تھی برف نے سیمیں کاری — خون بے جرم سے کرتا ہے اُسے گلناری
صیدِ فومیہ کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے — تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

ہے گزر جب کہ ترا جانبِ دریا ہوتا — اک طلسمات کا گو یا ہے تماشا ہوتا
ایسا تو حکمت و جادو سے جماتا ہی اُسے — سر بسر تختۂ الماس بنا تا ہے اُسے
کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں — جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہیں ڈاریں جاتیں
پل ہیں نے کشتی و پُل پار اُتر جاتے ہیں — سفری سیکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں
روئے دریا یہ گزر رشکِ نظر ہوتا ہے — ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملکِ فرنگ — اے زمستاں ہیں وہاں تیرے عجب عیش کے رنگ
بارہ سنگے کہیں تکھی ہیں اُڑاتے جاتے — جلوۂ تخت ہوا اور دکھاتے جاتے
نوجواں ہیں کہ جوانی کی شرابوں سے ہیں مست — پہلواں بے مئے و بے جام شرابوں سے ہیں مست
ہے زبس جوشِ دلی حوصلہ انگیزی میں — سب کمر بستہ ہیں میدانِ سبک خیزی میں
پاؤں ہیں کاٹ کے موزوں کو چڑھائے ہیں کھڑے — اور عصا اپنے سر برف جمائے ہیں کھڑے

آگے کو رپٹ کر ہیں نکلتے جاتے | اُچھل جاتے ہیں آگے کو پھسلتے جاتے
گھڑ دوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا | پر رپٹ دوڑ کا میدان نہ مارا ہوگا

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی | مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھرّاتا ہے | اور قلم ہاتھ سے تھرّا کے گرا جاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا جھکا لیتا | منہ سے کاغذ کی رضائی میں چھپا لیتا
مرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا | ترے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں | اب تمنا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں

طپشِ عشق سے دل رہوے مرا نرم سدا
گرمیٔ شعر و سخن سے سینہ رکھے گرم سدا

مثنوی مصدرِ تہذیب

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی | اور آفرینشِ عالم کی تھی سحر پہلی
مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا | اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا
وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی | اور ابتدا تھی زمانہ کے کارخانہ کی
اُفق میں تھا کوئی کا نور اُڑ رہا گویا | زمیں سے تا بفلک نور اُڑ رہا گویا
کنارِ کوہ پہ سورج تھا یوں دکھلائی | کہ جیسے گیند طلائی ہوا میں اُڑکائی
دکھا کے گوشۂ ابرو ذرا چمک جانا | لحافِ ابر میں منہ دے کے پھر دبک جانا
کبھی پہاڑ پہ سر بھی اُبھار لیتا تھا | شفق کے خون میں پھر غوطہ مار لیتا تھا
وہ دن جہاں میں تھا نوروزِ روزگار کا دن | جدھر کو دیکھئے گویا کہ تھا بہار کا دن

ہوا میں فیضِ مسیحا کی شان تھی گویا | کہ آئی قالبِ بیجاں میں جان تھی گویا
پڑے جھلکتے گلوں کے ایاغ تھے سارے | کھڑے لہکتے جوانانِ باغ تھے سارے
سحر کا فیض جو ہر خشک و تر پہ طاری تھا | تو آبِ بحر بھی کس کس مزے سے جاری تھا
دلوں کو موج کے دریا میں اضطراب نہ تھا | ہوا کے صدمہ سے رکھتا خطر حباب نہ تھا
نہ خوفِ لطمہ و گرداب غوطہ بازوں کو | نہ فکر بادِ مخالف کا تھا جہازوں کو
جو اپنی حد سے ہوا کچھ زیادہ ہوتی تھی | تو ناخداؤں کو بادِ مراد ہوتی تھی

زمین سبزۂ قدرت سے لہلہاتی تھی | صبا جو اُس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی
تمام دشت و چمن در چمن پڑے ہوئے تھے | پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے ہوئے تھے

شعاعِ مہر کا تھا ہر جگہ پہ کام جدا | ہر ایک کام میں کرتی تھی اہتمام جدا
ہوا میں بیل کے مقیش تھی اُڑا دیتی | زمیں پہ چادرِ مہتاب تھی بچھا دیتی
جگر میں شاخ کے پانی کو خوں بناتی تھی | اور اُس کے خوں کو گلِ لالہ گوں بناتی تھی

نگاہ ایک سی تھی سوئے خشک و تر اُس کی | گزر رہی تھی دلِ سنگ میں نظر اُس کی
کبھی جو تھی نگہِ لطف سرسری کرتی | تو دل میں کوہ کے تھی کیمیا گری کرتی
کہیں جو سنگ کو گرمی سے تاب دیتی تھی | تو اُس کو لعل و زمرد کی آب دیتی تھی

غرض کہ خلق میں دریا تھا فیض کا جاری | اور اُن میں کارِ خدائی تھے جا بجا جاری
اُٹھی دمامہ و دولت سے دفعتاً یہ صدا | اُڑی جہاں میں تہِ گنبدِ کہن یہ صدا
اٹھو کہ صبح سعادت کی نوبت آئی ہے | نظر کرو کہ عیاں شانِ کبریائی ہے

صدا کے ساتھ اڑ گئے سب کے خواب آنکھوں سے — دلوں سے اٹھ گئے پردے حجاب آنکھوں سے
نظر اٹھا کے جو دیکھا عیاں ہے نامِ خدا — کھلا ہے فیض کا در بہرِ بندگانِ خدا
جلوس ہے ملک القدس کا بر کوئے سریر — نگاہ ذرہ تو خورشید ہے بسوئے سریر
زبسکہ ذاتِ مقدس ہے اسکی ذات کمال — کھڑے ہیں دستِ ادب باندھے صفاتِ کمال
صفاتِ ذات ارکینِ دولت اسکے تھے — بنائے دولت و سامانِ صولت اسکے تھے

زبسکہ فیضِ سحر تھے دلوں پہ چھائے ہوئے — ظہورِ قدرتِ حق آنکھوں میں سمائے ہوئے
تھی اعتدال پہ جو واں کی بات ہوتی تھی — نہ دھوپ تیز نہ تاریک رات ہوتی تھی
شعاعِ مہر زیادہ چمک نہ سکتی تھی — اور اسکی نوکِ نگہ میں کھٹک نہ سکتی تھی
کرن ہو تیز تو بھی دھوپ وہ اس سے ٹل جاتی — بہت جو ہوتی اندھیری تو رات ڈھل جاتی

رواج عیب کا جلتا وہاں چراغ نہ تھا — دھواں بدی کا پہنچتا پئے دماغ نہ تھا
تھا رات دن کا برابر تلا حساب وہاں — ہمیشہ رہتا تھا میزاں میں آفتاب وہاں
ہوا کے واں چلن آکر درست ہوتے تھے — جو صرصر آئے تو زور اسکے سست ہوتے تھے
کبھی نسیم تھی آتی کبھی صبا آتی — اور اس روش سے وہ پھولوں کو تھی ہنسا جاتی
کہ آب و رنگِ جہاں رونقِ بہار سے ہو — پہ گل کے پہلو کو صدمہ نہ نوکِ خار سے ہو

جو بار طبع تھے واں آ کے سیدھے چلتے تھے — اور ان کے تکلے کی مانند بل نکلتے تھے
زیادہ و کم کو وہاں اعتدال تھے گویا — جو بد تھے نیک باصلاحِ حال تھے گویا
جو بد مزاج تھے واں خوش مزاج ہوتے تھے — سبھوں کی کج روشی کے علاج ہوتے تھے

وہ شاہ لطف سے تھا کر رہا جہاں پہ نظر — کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر
خدا کے بندوں پہ الفت زبس تھی عام اسکی — فروغ عام تھی مثل مہ تمام اس کی
وہ جوش الفت دل کام کر سکے پردہ میں — یکایک آنکھوں سے نکلا نظر کے پردہ میں
وہ حسن خلق جو پھیلا رہا شمیم اسکی — اسی پہ خاص تھی الفت عمیم اس کی
دیا یہ حکم کہ تم سوئے خلق جاؤ ذرا — ہمارے لطف کا جلوہ انہیں دکھاؤ ذرا
داں کی مملکتوں کا خراج اسکو دیا — بہار گلشن جنت سے تاج اس کو دیا
ہر ایک پھول کو سو رنگ و بو سے چمکا کر — اور اس پہ شبنم آب حیات برسا کر
کیا بجانب ملک فنا روانہ اسے — کہ ہو قیام قیامت تلک فنا نہ اسے

غرض کہ خسرو اخلاق خلق میں آیا — شمیم خلق سے باغ جہان مہکایا
ہر حسن خلق سے تسخیر کر لیا سب کو — کہ جیسے بستہ زنجیر کر لیا سب کو
بہار خلق سے اسکے ہوا چمن عالم — اور اس کے نور سے انجم کی انجمن عالم
شگفتہ روئی پہ صدقے بہار ہوتی تھی — دہن پہ خندہ جبینی نثار ہوتی تھی
وہ منہ سے بات جو کرتا تو پھول جھڑتے تھے — جو چپ رہے تو چمن آگے پاوں پڑتے تھے
کیا نہ دل میں بد و نیک کا خیال اس نے — ہر اک کو کر دیا خوشحال جب حال اسنے
جہاں میں بحر کرم اس کی ذات تھی گویا — وہ ذات چشمۂ آب حیات تھی گویا
جہاز بسکہ نہ محروم اس ابر تر سے کوئی — پھرا نہ خلق میں ناکام اسکے در سے کوئی
مدح خواں ہوئے سب اہل روزگار اسکے — دئے زمانہ میں شہرت نے اشتہار اسکے
سنڈ کے لوگ یہ نزدیک و دور سے آئے — کہ جیسے مور و ملخ ہوں دفور سے آئے
وہ اس کے بندۂ بے دام ہو گئے سارے — غلام خاص سے تا عام ہو گئے سارے

در امید کھلا تھا ہمیشہ سب کے لئے ۔ نہ حکم خاص تھا دن کا نہ قید شب کے لئے
اگرچہ بہر بد و نیک تھا کھلا دربار ۔ دل سخی کی طرح تھا ہمیشہ وا دربار
زیادہ سب سے قباحت یہ رو بکار آئی ۔ کہ بزم جشن میں خلقت جو ایک بار آئی
تو خاص و عام وہاں آ کے بار یاب ہوئے ۔ سبھوں کو واں سے عطا خلعت و خطاب ہوئے
انہی میں **ہزل و تمسخر** کے بھانڈ بھی آئے ۔ **ظرافتوں** نے بہت باغ سبز دکھلائے
لطائف ان کے یہ دربار کو پسند آئے ۔ کہ شہ کی خدمت عالی میں سربلند ہوئے
رہے جو خلوت و جلوت میں روز و شب داخل ۔ مصاحبوں میں ہوئے رفتہ رفتہ سب داخل
غرض کہ **ہزل و تمسخر** ہوئے وزیر اس کے ۔ بہت سے اہل ظرافت ہوئے امیر اس کے
اثر زمانے پہ اس کا اگرچہ بجا نہ ہوا ۔ جو اس کو مد نظر تھا وہ مطلقاً نہ ہوا
ادب کے طور طریقے بگڑ گئے ان کے ۔ قدم طریق وفا سے اکھڑ گئے ان کے
رہا دلوں پہ نہ رعب اس کی حکمرانی کا ۔ سمجھ کے پی گئے سب اس کو گھونٹ پانی کا
حیا و شرم و ادب سے خلاف کرنے لگے ۔ ادب کے قاعدوں سے انحراف کرنے لگے
ہر ایک بات میں چالاکیاں لگے کرنے ۔ حضور شاہ میں بے باکیاں لگے کرنے
یہ **حسن خلق** تمسخر کا نام رکھتے تھے ۔ جو بات کہتی **نصیحت** تو نام رکھتے تھے

یہ دیکھا خسرو اخلاق نے جو حال ان کا ۔ اور ان کے حال نے دکھلا دیا مآل ان کا
اگرچہ خلق و مروت کا بادشاہ تھا وہ ۔ اور ایسی باتوں پہ رکھتا نہ کچھ نگاہ تھا وہ
پر اس نے دیکھا کہ ان میں وفا نہیں باقی ۔ اور ان کی آنکھوں میں شرم و حیا نہیں باقی
رقم کیا **ملک القدس** کو یہ حال ان کا ۔ لکھا کہ حال سراسر ہے پر وبال ان کا
شتاب چشم کرم سے نگاہ ہو جائے ۔ کہ روئداد جہاں رو براہ ہو جائے

غرض جو بھیجی شہِ خلاق نے لکھی عرضی
وہ بزمِ قدس میں ساری پڑھی گئی عرضی
وہاں نگاہ توجہ کمال اُس پہ ہوئی
بہت سی قدسیوں میں قیل و قال اُس پہ ہوئی
ہاروں کی ساری بداطواریاں بھی دیکھی گئیں
ظرافتوں کی ستمگاریاں بھی دیکھی گئیں

غرض کہ بزمِ مقدس میں گفتگو کر کے
ہر اک کے ظاہر و باطن میں جستجو کر کے
کھلا کہ ہو گئے بیباک یہ جو سارے ہیں
اور اسمیں سارے بداعمالیوں کے مارے ہیں
یہ بے سبب نہیں گستاخیوں میں آئے ہوئے
یہ حسنِ خلق کے ہیں سارے گل کھلائے ہوئے
سو **قوتِ غضبی** کو ذرا اشارہ ہو
کہ ساتھ اُس کے عمل میں حکومت آرا ہو
وہ حسنِ خلق سے مل کر دوا کا کام کرے
جو دل مریض ہیں اُن پر شفا کا کام کرے

غرض کہ **قہر** کو فرمانِ خسروانہ ہوا
بلا کی طرح سے وہ دفعتاً روانہ ہوا
چلا وہاں سے مگر اس کڑک دمک سے چلا
کہ جیسے شعلۂ باروت ہو بھڑک کے چلا
بسانِ اژدرِ خونخوار سر اُٹھائے ہوئے
اور آسپہ کلۂ شیر سے چڑھائے ہوئے
قضا نے آگ کے سانچے میں اسکو ڈھالا تھا
جلا ہوا تھا دل ایسا کہ رنگ کالا تھا
بدن پہ اینٹھے تھے غیظ و غضب کے مارے بال
کھڑے تھے شیر کی مونچھوں کی طرح سارے بال
تھے مارے طیش کے نتھنے پھڑک رہے دونو
برنگِ شعلہ تھے دیدے چمک بھڑک رہے دونو
یہ پیچ و تاب میں تھا اپنے زہر کا مارا
کہ دانت پیستا آتا تھا قہر کا مارا
غضب سے چہرہ پہ گویا جنوں برستا تھا
جو دیکھتا تو نگاہوں سے خوں برستا تھا
گرج تھی ابر کی اور آندھی اُسکے ساتھ میں تھی
بجائے تیغ کڑکتی بجلی اُسکے ہاتھ میں تھی
خود اک بگولے کے اوپر سوار آتا تھا
غبار آگے اُڑاتا شرار آتا تھا

غرض کہ آیا اور اِس آن بان سے آیا کہ جیسے قہرِ خدا آسمان سے آیا
وہ اُس کا آنا جہاں پر غضب کا آنا تھا نہ اُس کا نیک تھا اپنا نہ بد بیگانا تھا
پڑے تھے تہلکے دنیا کے کارخانے میں اور اُس کے آنے سے بھونچال تھے زمانے میں
وہ دونوں ہزل و تمسخر جو تھے وزیروں میں اور اُنکے ساتھ ظرافت کہ تھی امیروں میں
سب ایسے بھاگے کہ اُن کا کہیں نشاں نہ ملا سرِ زمیں نہ ملا زیرِ آسماں نہ ملا
بہت سے لوگ مقامِ حساب میں آئے بہت سے ترکِ ادب کے عتاب میں آئے
چھٹے تب پہ ادب کے جو تازیانے لگے تو مارے ڈر کے جگر سب کے تھرتھرانے لگے
ہزاروں قمچیوں سے پٹ کے فرشِ خاک ہوئے ہزاروں خنجرِ تعزیر سے ہلاک ہوئے
بہت سے اپنے کئے کی سزاؤں میں آئے بہت گئے نہ گئے کی بلاؤں میں آئے
پر اُس کے ڈر سے کوئی دم بھی مار سکتا نہ تھا جو روتی آنکھ تو نالہ پکار سکتا نہ تھا

اگرچہ جو تھا جہاں میں غضب کا مارا تھا اور اُس پہ قہر جو تھا سب پہ آشکارا تھا
پہ شکوہ کر نہیں سکتے تھے پہ نہار اُس کا نہ حال لکھتے تھے اخبارِ روزگار اُس کا

مگر وہ شاہ کہ تھا جس پہ کُل کا حال کھلا اور اُس کے حال میں اک اک کا تھا مآل کھلا
نہ اپنے بندوں کا یہ حالِ زار دیکھ سکا نہ درد و غم سے اُنھیں دلفگار دیکھ سکا
کیا اشارہ یہ تہذیب کو کہ جاؤ ابھی اور اعتدال پہ اُنکے دلوں کو لاؤ ابھی

اُدھر سے جب یہ عنایاتِ خسروانہ ہوئی تو بزمِ قدس سے تہذیب اُدھر روانہ ہوئی
وہ سوئے اہلِ زمیں ایسی شان سے اُتری کہ جیسے رحمتِ حق آسمان سے اُتری

نہ اُس کے تاج دُرفشاں ہوا رکھا سر پر
نہ کوئی چتر جواہر نگار تھا سر پر

مگر عمامۂ خاص اُس کو مشتری نے دیا
اور اپنا چتر تھا طالع کی یاوری نے دیا

تھے وہ جو علم نے خلعت اُسے پنھائے ہوئے
اور اُس کے قامتِ موزوں پہ ٹھیک آئے ہوئے

اثر عدو کے خدنگِ کلام کرتے نہ تھے
اور اعتراضوں کے تیر اُس پہ کام کرتے نہ تھے

کلام ہاتھ میں تھا آگے تیغ تیز لیے
تھے جوہر اُس میں سخنہائے شعلہ ریز لیے

بنائی آتی تھی تدبیر سارے کام اُسکے
خرد تھی کر رہی پردہ میں انتظام اُس کے

تھی صنعت اپنی گلِ تر بکھیرتی آتی
اور اُن کا رنگ زمانہ پہ پھیرتی آتی

اُسی کے رنگ میں دولت تھی جگمگاتی ہوئی
کہ دونوں ہاتھوں سے تھی سیم و زر لٹاتی ہوئی

فلک سے جبکہ زمیں پر وہ نیک نام آئی
لیے جہان میں آرامِ خاص و عام آئی

وہیں محاسنِ اخلاق بڑھ کے ساتھ ہوئے
جھکا کے غیظ و غضب سر کو ساتھ ساتھ ہوئے

وہ آپ ٹیکتی آتی تھی تمکنت کی چھڑی
کہ تمکنت کی چھڑی تھی وہ سلطنت کی چھڑی

نہ بات ہر کس و ناکس سے تھی ذرا کرتی
وزیر عقل سے تھی گر تھی مشورہ کرتی

جو حکم کچھ سرِ دربار برملا ہوتے
تو اُس کی کم سخنی میں سخن ادا ہوتے

تھی دوربیں کی جگہ ہاتھ میں لیے اخبار
جہاں کی سیر تھی اُس کو دکھا رہے اخبار

خلاف وضع نہ تھی بات مطلقاً کرتی
ہنسی کے حق کو تبسم میں تھی ادا کرتی

غرض کہ پہلے ہی جو اُس نے جشنِ عام کیا
تو نظمِ خلق کا پہلا یہ انتظام کیا

کہ مدرسے ہیں جو عالم میں جابجا جاری
یہ حکم اُن میں بتاکید ہو نیا جاری

کہ لڑکے یاں کے جو محنت زیاد کرتے ہیں
زباں سے لفظ و معانی کو یاد کرتے ہیں

مگر دلوں پہ اثر اُن کے زینہار نہیں
اور آئنہ رکھتے یقیں اہلِ روزگار نہیں

اگر دلوں پہ اثر ہو تو کیوں عمل نہ کریں — بدی کو اپنی وہ نیکی سے کیوں بدل نہ کریں
یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں — اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں
کہ لفظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے — یہ اُن کو منہ سے ہیں بک بک کے نہجاں ہوتے
اب اُنکے ساتھ مطالب کے بھی اثر ہوویں — دلوں میں اُنکے یقیں کرتے کرتے گھر ہوویں

یہ حکم جب ہو اور بادشاہ سے جاری — ہوا نہ تھا ابھی دفتر کی راہ سے جاری
اِدھر اُدھر کو جو گھاتوں میں بیٹھے لگے اخبار — وہاں زباں بزباں اُسکو لے اُڑے اخبار
ہوا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری — کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جا بجا جاری
نہ ان کی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں — وہ سب رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں
کہ ان کا فیض مقاصد ہو عام عالم میں — رہیں عوام کے چرچے تمام عالم میں
ولیکن اُن کو بھی تاکید یہ زیادہ ہو — کہ فائدہ کی جو کچھ بات دل نہادہ ہو
باتفاق اُسے مل جل کے رو براہ کرو — اور اختلاف سے کاموں کو مت تباہ کرو

مثنوی شرافتِ حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا — نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانماں سے غرض — یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشاں سے غرض
تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں — گھرانے اچھے۔ گھر اچھے۔ تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں — امیر ہو کہ فقیر۔ اس سے کچھ سوال نہیں

کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے
بزرگ صاحبِ زر ہیں تو لیکے زر بیٹھے
یہاں تو مایۂ ہمت ہیں جو زیادہ ہے
بزرگ امیر تھے اور خود امیر زادہ ہے

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
کہیں سے بارِ وطن اُٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جبکہ پھول ہو تم
کمال اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

عدم سے آن کے کس خاک پر گرے پہلے
وہ کیا زمین تھی جس پر قدم پھرے پہلے
گزارا تم نے لڑکپن ہے قصرِ شاہی میں
کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مجھے نہ فخر ہے اس کا نہ عار ہے اس کی
مگر تلاش ہے تو بار بار ہے اس کی
کہ رکھتے ملکِ مروت میں رسم و راہ ہو کیا
دکھاتے ہمتِ عالی میں دستگاہ ہو کیا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایہ
نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں
سبک سبک ہیں دیا ہیں گرانبہا چیزیں
میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلا دو مجھے
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے
متاعِ حسنِ دیانت دکاں میں ہے کہ نہیں
وفا کی جنس بھی اس کارواں میں ہے کہ نہیں

یہ مانا میں نے کہ باعقل و ذی شعور ہو تم
مقامِ تجربہ کاری میں پہنچے دور ہو تم
نہ کچھ مقدمہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں
نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں
پر اس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم
کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم
زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے
ثواب ہائے خدا کو عذاب کرتی ہے

۴

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں — جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں
کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ بر زبان تو کیا — اور اُن میں پاس ہوئے دے کے امتحاں کہ نہیں
تمہارے خُلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں — زباں سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں
فقط جو عالمِ ذی شان ہو گئے تو کیا — مرے حسابوں وہ شیطان ہو گئے تو کیا

جو کچھ کہ مُنہ سے کہو اُس کا ہو اثر دل میں — کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کرے وہ گھر دل میں
زبان و دل ہیں بہم جب کہ ایک ہو جاتے — تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے
وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں — ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پوچھو تو ہے پھر بھی ناتمام وہ علم — تمام جب ہو کہ پہنچائے فیضِ عام وہ علم
وہ علم جس سے کہ اوروں کو فائدہ نہ ہوا — ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہ ہو — مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو سکے تو ہو
میانِ جلسہ جو آزاد پوچھے آ کے کبھی — کہو کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی
کہ باصفا و سبک روح و پاک جاں ہم ہیں — تو تم جواب میں جھٹ بول اُٹھو کہ ہاں ہم ہیں

معرفتِ الٰہی

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش — فصلِ گُل آئی ہے بجوش و خروش

کیا پڑے کُنجِ غم میں ہو بیکار — گُل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار
لطفِ صحبت بہم غنیمت ہے — میاں آزاد دم غنیمت ہے
چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر — گُل و گلزار و یاسمن کی سیر
گرچہ بہرِ عوام کالانعام — لطفِ گلگشت ہو گیا بدنام
پر کرو دل میں تم جو اپنے غور — ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور
نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط — قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط
سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں — کہ بُری خلق کے گماں میں ہیں
صرف ہووے گر اُس میں حسنِ خیال — تو ہو پھر نقص اُس کا عین کمال
گُل و سنبل سے تا بخس و خاشاک — خاک سے تا بہ گلشنِ افلاک
رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی — نہیں عبرت سے کوئی شے خالی
ہر ورق ہے شجر پہ بہرِ حساب — بکفِ دستِ موعظت کی کتاب
گوشِ عبرت نہیں تو کھولتا ہے — ورنہ ہر برگ نمایاں کا بولتا ہے
ہر زباں برگِ گوشِ دل گُل ہے — تو ہی مدہوشِ نشۂ گُل ہے
ایک دن دل جو میرا گھبرایا — کلبۂ غم سے میں نکل آیا
دل تھا پژمردۂ غنچہ وار ادھرا — ہوا گلزار میں گزار ادھرا
پھر رہے پھرتے جو دل میں آیا — پا کے اک جا درخت کا سایا
بیٹھا میں بہ کنارِ آبِ رواں — کہ ہے عمرِ رواں حسابِ رواں
کی جو یک بار آنکھ اٹھا کے نظر — برگ اک ٹوٹ کر ز شاخِ شجر
آ پڑا اپنے جوں پیامِ سروش — اور ہوا میری زینتِ آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال — پر وہ کہتا تھا فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشمِ بینا ہے — تو یہ قدرت کی لوح بینا ہے

نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ — دیکھ ان کو بہ چشمِ اندیشہ
صانعِ غیب کا ہے کارِ بدیع — کلکِ صنعت کا ہے نگارِ بدیع
روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا — تھا رگِ شاخ میں مقام مرا
فیضِ آب اور باد کی نرمی — اُس کی نرمی و مہر کی گرمی
مادرِ خاک سے ہوئے دوچار — رُوح جنبش میں آگئی یکبار
مُنہ کو گردِ عدم سے صاف کیا — سینۂ شاخ کو شگاف کیا
سبز کوپل تھا جب نکالا سر — پر وہ کوپل تھی غیرتِ گلِ تر
کھائی میں نے جو اُس چمن کی ہوا — دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا
میرا یُمنِ قدم یہ آیا راس — ہوگیا ہر درخت خضر لباس
زاد و برگِ شجر ہوا مجھ سے — گُل کا آباد گھر ہوا مجھ سے
بار مجھ میں نہ زینہار آتا — پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاج سر میں سپے نہال ہوا — مجھ سے سارا چمن نہال ہوا
سروِ گل کا جب قشون آتا — میرا پرچم تھا پہلے لہراتا
سب کے سر پر تھا نخل کا سایا — میرا سایا تھا نخل پر چھایا
جس سے سارے جہاں کو راحت تھی — ہر مسافر کو استراحت تھی
شاخِ گل تھی ہری بھری مجھ سے — زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے
تھے رفاقت سے میری سرو آزاد — مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد
چشمِ نرگس چمن کا جوبن تھی — برگ گویا زبانِ سوسن تھی
ساری ذات و صفات ہیں مجھ میں — گُل میں جو کچھ ہے بات ہے مجھ میں
سنی بات مجھ سے چھوٹی ہے — مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے
مرہمِ زخمِ جان و خاطرِ ریش — برگ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے
ہست کو نیستی ملازم ہے

اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو   باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو   ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن   دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن   اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھوے اپنے نشانِ ننگ و نام نے   باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے   دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم   کرتے ہو کیا امیدِ یمین و یسار تم
میدانِ عزم و جزم کے ہو شہسوار تم   بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
چلّا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اُٹھائینگے   دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائینگے   نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اُجال دو   پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو

شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو   ہو خوف کا خیال تو ہنس کے ٹال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو
آگے بڑھو کہ اب نہیں تابِ قرار ہے   کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے   ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو
رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم   اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم   دو رخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو
یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے   آبِ رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے   جو تھم رہے وہاں وہی خر در وحل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو
آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے   چمکایا چہرہ صبح نے باآب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے   اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو
نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے   اب خاتموں پہ آگئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے   وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لئے
ہے کرنائے جنگ کی الحان چلے چلو

سلام علیک

خدا کی نظر آ رہی شان ہے   سہانا سا اک سبز میدان ہے

ہوا سے جو سبزہ ہے لہرا رہا — تو ہے دیکھنے سے مزا آ رہا
ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی — ہوا لوٹ کر لہر کھاتی ہوئی
کوئی دل جو مٹی میں ہے مل گیا — تو اک آدھ گل ہے کہیں کھل گیا
وہیں ایک پہاڑ میں تالاب ہے — کہ دن دھوپ اور رات مہتاب ہے
یہ سبزی اسی کے سہارے پہ ہے — درختوں کا جھرمٹ کنارے پہ ہے
لب آب جو ہیں شجر جھومتے — وہ ہیں جھک کے پانی کا منہ چومتے
سماں آج کل ہے گا برسات کا — مزا دن کا ہے لطف ہے رات کا
درخت اک جگہ ہیں جو چھائے ہوئے — ہوا اور بنگلے بنائے ہوئے
تو اک چھوٹے لڑکے نے واں آنکر — جگہ خوب موقعے کی پہچان کر
رکھا سامنے اپنا جزدان ہے — ورق پر لگائے ہوئے دھیان ہے
بہت لکھنے پڑھنے کا ہے ذوق اسے — یہی ذوق ہے اور یہی شوق اسے
ڈھلا ہے گا دن بج چکے چار ہیں — گئے سیر کو اس کے سب یار ہیں
ولیکن دہم صبح یا شام ہے — شب و روز اسے کام سے کام ہے
اسی شغل میں اب بھی مشغول ہے — بنا بیٹھا اک مرد معقول ہے
خدا جانے ہے ہاتھ میں کیا کتاب — کہ اس میں ہے ڈوبا ہوا ہی در آب
اور آتی ہے جوں جوں سیاہی شام — وہ شوقین لڑکا بذوق تمام
جھکا جاتا ہے اس طرح غور سے — کہ کاغذ میں کیڑا ہو جس طور سے
نظر اس کی جب تھرتھرانے لگی — سیہ شام سرمہ اڑانے لگی
بہت بیٹھے بیٹھے جو تھک سا گیا — اک انگڑائی لے کر وہ لڑکا اٹھا
ملا کر بہم چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ — لیے چہرے پر لطف محنت کے ساتھ
تھا فارغ جو ہو کر اٹھا کام سے — تو دیکھو لا برنگ شفق شام سے

لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

رکھا پھر کتابوں کو جزدان میں — ٹہلنے لگا آ کے میدان میں
لگی ٹھنڈی ٹھنڈی جو منہ پہ ہوا — حواس اُس کے آئے ٹھکانے ذرا
تھے دن کے تھکے ماندے جو جانور — وہ اپنے مقاموں میں سب آن کر
بہم مل کے آوازیں دینے لگے — بسیرے درختوں پہ لینے لگے
وہ مل جل کے آپس میں تھے بولتے — کہ اپنی خوش آوازیاں تولتے
درختوں پہ چڑیوں کی چوں چوں کہو — پپیہو تو پھر یاد ہے پیوں کہو
جو سبزے میں جھینگر تھے برسات کے — وہ لے چھیڑ اُنھوں نے بھی سُر رات کے
کئی غول طوطوں کے چہکارتے — گئے سبز سبزا ایسے بل مارتے
تھا لڑکا بھی حیران یہ کیا ہو گیا — کہ میدان کا سبزہ ہرا ہو گیا
کلولوں میں سناٹے بھرتے ہوئے — وہ تھے اس طرح باتیں کرتے ہوئے

کہ خوش ہو کے بولا وہ رنگیں کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

کیا تھا تمہ دن کا جب شام نے — تو لی گھر کی راہ اُس خوش انجام نے
اِدھر اور اُدھر کو نظر ڈالتا — چلا جاتا تھا دیکھتا بھالتا
کہ کچھ گائیں بھینسیں ملیں راہ میں — پھریں کھیت سے گھر کی کچھ چاہ میں
ٹپکتی خوشی صورت حال سے — عجب جا رہی تھیں لٹک چال سے
بھرے دودھ سے تھن لٹکتے ہوئے — کہ مشکیزے جیسے چھلکتے ہوئے
کئی ساتھ ساتھ اُن کے گوسالے تھے — کہ ماؤں سے تھن کے تلے پالے تھے
اور اک گلہ بان پیچھے آتا ہوا — خدا الغوزہ اپنا بجاتا ہوا

ملیں راہ میں اُسکو کچھ بکریاں — اور اک بوک بکرا رہا اُن درمیاں
کئی بربری اُن میں گلزار تھیں — پہاڑی تو دودوں دودھ میں سرشار تھیں
وہ دودھ دواں نہائی تھیں پوتوں پھلیں — کہ دن بھر تھیں چر چگ کے گھر کو چلیں
پُھدکتے وہ بچے اُچھلتے ہوئے — تھے اٹکھیلیوں سے مچلتے ہوئے
محبت سے چمٹا جاتا کوئی — بہت تھمک کے ماں کو بلاتا کوئی
اُنہیں دیکھ کر گھر کے شوقوں میں شاد — لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش نہاد

بھرو شیر مادر سے اُلفت کے جام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

وہ لڑکا جو پہنچا بہ نزدیک شہر — نظر آئی یاں اور ہی لہر بہر
دکانوں پہ روشن سراسر چراغ — چراغوں سے گویا لگائے تھے باغ
جو رونق کہ نیچے دکانوں پہ ہے — کچھ اس سے سوا بالاخانوں پہ ہے
دکھاتے جو ہیں روشنی دور سے — اڑی جاتی ہیں کھڑکیاں نور سے
تصاویر و نقشوں سے گلزار گھر — طرحدار کمرے ہوادار گھر
کہیں مل کے بیٹھے ہیں کوٹھے پہ یار — کہیں شعر خوانی ہے گاہے ستار
غزل ریختے کی ہے گاتا کوئی — ہنسے گا کوئی اور بجاتا کوئی
لطیفوں پہ اُڑتے ہیں جو قہقہے — کہاں یاد بلبل کو یہ چہچہے
غرض ہر جگہ سے گزرتا ہوا — تماشے خدائی کے کرتا ہوا
گیا جب کہ گھر میں وہ روشن چراغ — تو ماں باپ بھی ہو گئے باغ باغ
خوشی سے نہ جامے میں پھولوں سمائے — بہن بھائی بولے وہ آئے وہ آئے
سلام اُس نے پہلے کیا باپ کو — جھکایا بہ حسن ادب آپ کو

دعا دی یہ اُس نے بھی لیکر سلام

مبارک مبارک خوشا وقت شام

بچھا صحن میں تھا بڑا سا جو تخت وہاں آ کے بیٹھے وہ فرخندہ بخت
لگا سامنے آ کے دستار خواں بہم کھا کھلا کر ہوئے شادماں
فراغت ہوئی کھانے پینے سے جب بچھونوں پہ آئے قرینے سے سب
برابر برابر بچھے تھے پلنگ پڑیں چادریں اُن پہ مہتاب رنگ
فلک نیلگوں رنگ نکھرے ہوئے ستارے تمام اُن پہ بکھرے ہوئے
چمک کر چڑھا چرخ پر چاند تھا کہ سورج کا شمسہ کر دیا ماند تھا
ادھر چاندنی نور پھیلا رہی سیاہی اُدھر رنگ دکھلا رہی
وہ چھائی ہوئی رات تاروں بھری کہ چادر ہو جیسے ستاروں بھری
پلنگڑی پہ لڑکا تھا لیٹا ہوا کہ بیٹا تھا شکر لپیٹا ہوا
پدر تھا جو تاریخ کا رازداں سُناتا تھا ہر دم نئی داستاں
کبھی کرتا خود شعر خوانی تھا وہ کبھی سُنتا ماں سے کہانی تھا وہ
دیا یہ مزہ اُن حکایات نے کہ انگڑائی گردوں پہ لی رات نے
ہوا آ کے پنکھا ہلانے لگی ہر اک کو غرض نیند آنے لگی
تھکے ماندے دن بھر کے تھے ہو رہے دوپٹے لیے تان اور سو رہے
بیاں کیا کروں رات کی شان کا زمانہ میں عالم وہ سنسان کا
پڑا نیند میں مست سارا جہاں نہ تھے چور باقی نہ تھے پاسباں
پڑے سوتے تھے جیسے بیہوش تھے کہ گھڑیال تک بھی تو خاموش تھے
درختوں میں تھیں جو گذرتی ہوائیں زمانہ پڑا کرتا تھا سائیں سائیں
شب تار کبھی نیند میں آن کر سیہ چادر اپنی پڑی تان کر
ہمیشہ زمانے کا دستور ہے اندھیرے سے کرتا عیاں نور ہے

کہ چمکا ستارہ سحرگاہ کا — ہوا رنگ پھیکا رخِ ماہ کا
ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں — تعجب سے مشرق کو تکنے لگیں
شبِ تار کا رنگ فق ہو گیا — چراغِ سحر جاں بحق ہو گیا
ہوئی یک بیک روشنی سی نمود — اُبلنے لگا دیگِ مشرق سے دود
سحر کے جو عالم نمودار تھے — دھوئیں اُڑ رہے تھے شبِ تار کے
لگے بولنے سب سحر کے طیور — گئی اُن کی آواز نزدیک و دور
وہ لڑکا جو تھا بسترِ خواب میں — ستارہ ہو جوں چادرِ آب میں

اُٹھا کر کہا اُس نے تکیہ سے سر
سلام علیک اے مبارک سحر

جیسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقعِ عبرت بنا دکھاتا ہے — اور ایسے شخص کا ایک ماجرا سناتا ہے
کہ جیسا بنا تھا ویسا مٹا کا رہا نہ اُسکے لئے — بچپن جوانی بڑھاپا یہی تھا زمانہ اُس کے لئے
فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا — جو پوچھو کون ہے؟ تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا
مٹایا گردشِ گردوں نے آہ نام اُسکا — نہ آج نام ہے اُسکا نہ کچھ مقام اُس کا

پر اتنا جانتے ہیں کہ غمگین و شاد ہونے سے — خوشی کے ہنسنے سے اور درد و غم کے رونے سے
کبھی امید سے اور گاہ ناامیدی سے — کبھی خطر کی خبر گاہ خوش نویدی سے
جو ایک رنگ سا آتا تو ایک جاتا تھا — خیال اُس کا مرقع نیا بناتا تھا
یہ دل جو سینہ میں جنبش ہے دمبدم کرتا — کہے ہے وہی یہ ہر اک زندگی کا دم بھرتا

دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے کوئی یقیں ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے
ہمائے ہمت عالی کا اوج پر جانا کبھی بہ جبر کبھی خود بخود اُتر آنا
غرض اُٹھاتا یہ کیفیتیں ضرور تھا وہ کہ آخرش یہی انسان باشعور تھا وہ

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا جہاں کہ شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا
جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہہ چکا ہے وہ جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ
مگر میں کیا کہوں تجھ کو تو اب یہ رونا ہے کہ جو وہ آج ہے اک دن وہ تم کو ہونا ہے

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں یہ سال و ماہ جو موسم کے انقلاب میں ہیں
بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں بہاریں سرِ سبزہ کو تاج دیتے ہیں
یہ فرش خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پہ یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر
جب اُسکے طوق گلو زندگی کا قصہ تھا تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصہ تھا
یہ سب کچھ اب بھی ہے پر اُسکی کچھ خبر بھی نہیں جو ہو تو نفع نہیں گر نہ ہو ضرر بھی نہیں
بلا سے اُس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے دیا کہ ملکِ فنا گلشنِ بقا ہو جائے
وہ آپ ہی جب نہ ہوا پھر جہاں ہوا نہ ہوا زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہوا نہ ہوا

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں
یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے ستارے جن سے زمین آسمان روشن ہے
کسی میں دور کا اُسکے نشاں نہیں باقی پتا تلک بھی تہِ آسماں نہیں باقی
قضا نے لیکے الٰہی کہاں چھپایا اُسے زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اُسے

کسی کے حسن پری وش کا وہ دیوانہ تھا — اور اُس کے تیر ادا کا ہوا نشانہ تھا
پر اب جو دیکھو تو وہ غیرت پری بھی نہیں — وہ اُس کے ناز وہ انداز دلبری بھی نہیں
فنا کے بزم میں ساقی نے اُس کو جام دیا — مرض کا نام کیا موت کا پیام دیا
طبیب آئے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی — خود آیا حسن سفارش کو پر ذرا نہ چلی
فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے — دہانِ گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

ازل کی صبح کہ جس میں جہاں ہوا پیدا — اور اُس کے ساتھ ہی گویا ہوئی فنا پیدا
کتاب عمر جہاں آج تک پڑھی میں نے — ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی میں نے
ہر اک کا راز ہے اُس میں کہیں کہیں کھلتا — پر اُس غریب کا احوال کچھ نہیں کھلتا
بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچھ بتا تو سہی
ہے وہ بھی اتنا ہی کہتا کہ کوئی تھا تو سہی

جغرافیۂ طبعی کی پہیلی

جو منشی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر زبانہائے مشرقی کی فرمائش سے نظم کی گئی

ہنگامۂ ہستی کو — گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک و تر عالم — صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے — یا پانی کا قطرہ ہے

حکمت کا مرقع ہے جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری اور کرتا ہے گلکاری
اک رنگ کہ آتا ہے سو رنگ دکھاتا ہے

اور دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خرمہرۂ رنگیں ۔ یا بلور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ و ہر ساعت قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے پر اُن کو نہیں پروا
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے اور ہے تو سبب کیا ہے؟

ایسے بھی مگر اکثر ارباب بصیرت ہیں
جو کھولے ہوئے ہر دم ہیں دیدۂ عبرت کو
ذرہ ہو کہ ہو سورج معنی ہو کہ ہو صورت
ہر جلوۂ قدرت میں سرمہ انہیں حکمت کا
سرمایۂ بینائی اور عینک عبرت ہے
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی جس سے کہ زمانہ کی
گرمی ہو و یا سردی یا ہووے تری خشکی
حکمت کا معمّا ہے قدرت کی پہیلی ہے
نقطہ ہے اگر اس میں ہے عقدۂ سربستہ
عقدہ ہے اگر اس میں ہے نکتۂ برجستہ

اک سیدھی سی بات اس وقت آتی ہے تصور میں
وہ یہ ہے کہ دو چیزیں کیا ایسی ہیں دنیا میں
آپس میں جو رکھتی ہیں پیوند زناشوئی
اولاد سے جن کی سب آباد زمانہ ہے
نقلی نہیں افسانہ سب نے اسے مانا ہے
اور پھر انہیں دونوں کو دیکھو جو نظر بھر کر
ماں بیٹی کا ہے ناتا دونوں میں نظر آتا
شورش گہ عالم میں پیدائشیں لاکھوں ہیں
اصلوں کی بہت نسلیں رشتوں کے سر رشتے ہیں
اس پیچ کا پر رشتہ دیکھا نہ سنا کوئی

آزاد بھلا ہے کون جو آگے ترے بولے
پابند گرہ کھولے ہاں یہ کہ مگر تو ہی
کہہ سن کے سوال اپنا دے آپ جواب اپنا

وہ دو کہ بہم جن میں ہے عقد زن و شوہر
عالم میں ہیں دو جوہر خشکی و تری جن سے
صنعت گہ قدرت میں پیدا و ہویدا ہیں
سب عالم جسمانی حیوانی و انسانی

اور دو کے رشتے ہیں گر غور کرو دل میں

تو دیکھ لو پانی کو — جس رنگ میں جی چاہے
بادل ہو کہ ہو باراں — قطرہ ہو یا دریا
شبنم سے بھی کم ہووے — یا تام کو کم ہووے
اک عرصۂ خاص اس پر — گزرے گا تو دیکھو گے
خشکی کے نشاں ہوتے — اس میں سے ہویدا ہیں
یا بچے ہیں جو ماں کے — آغوش میں پیدا ہیں

کیوں قبلۂ من دیکھا — یہ طرفہ معمّا ہے
کیا بوجھے کوئی پنڈت — یا فلسفی و مُلّا
ہاں سمجھیں میاں **اکبر** — یا منشی **ذکاء اللہ**
سنبل ہے یہ سبزہ میں — پھولوں میں چنبیلی ہے
کون اس کو بھلا بوجھے
حکمت کی پہیلی ہے

مبارک باد جشن جوبلی

اے خوشی آ ترے آنے سے زمانہ روشن — آ، کہ تو آپ ہے روشن ترا آنا روشن
اے خوشی آ ترے آنے سے ہے گھر گھر شادی — ہے ترے آنے سے ہر لب پہ مبارکبادی
یاد میں بیٹھے تھے یارانِ دلِ آگاہ تری — سالہا سال سے تھے دیکھ رہے راہ تری

ہم خوشی اس کو نہیں کہتے جو ہر سال آ جائے — خلعتِ عید میں ہفتی ہوئی خوشحال آئے

کبھی عید رمضاں ہو کبھی عید قرباں
ہاتھ پھیلائے گلے ملتے ہیں بصد خوبی جو لوگ
عیدیاں بانٹ کے بچوں کے جو دل شاد کرے
ہو دل و ہنگامہ سے بازاروں کو آباد کرے

خوشی اسکو بھی نہیں کہتے جو نوروز سے ہو
گل و گلشن کے لئے جشن دل افروز سے ہو
سبزۂ و گل میں عیاں عالم نیرنگ کرے
خاک کو سبز کرے سبزہ کو گلرنگ کرے

وہ خوشی کیا کہ ہو رخ جس کا فروزاں شب کو
اور دوالی ہے کہ ہے جشن چراغاں شب کو
جابجا ساتھ کھلونوں کے مٹھائی بانٹے
کہیں آٹا کہیں پیسا کہیں پائی بانٹے
خوشی اس کو نہیں کہتے کہ کرے تام خوش
امتحاں لیکے کرے بچوں کو انعام سے خوش

وہ خوشی کیا کہ جو گھر بیٹھ کے ہم آپ کریں
ہر برس سالگرہ بچوں کی ماں باپ کریں

ہے حقیقت میں خوشی وہ کہ بہ افضال خدا
ہند پر **قیصرۃ الہند** ہوں فرماں فرما
جب بہ اقبال و حشم گزریں اُسے سال پچاس
جابجا جشن خداساز کے ہوں دیں اجلاس
ہوں سے لاہور میں دربار نشاط و شادی
اور پڑھے آن کے آزاد مبارکبادی

یہ خوشی وہ ہے کہ دل جس سے ہیں خنداں خنداں
یہ خوشی وہ ہے کہ ہو عید بھی قرباں قرباں
ہے خوشی عام دلوں کے لئے اور جاں کے لئے
یہ خوشی عام ہے ہندو و مسلماں کیلئے
کہتے ہیں بندہ بے دام و درم حاضر ہیں
اور اگر جان کا ہو تو دم حاضر ہیں
کہ وہ سارے تھے جو اوپر کے تارے پھرتے
اور سعادت یہ نہ تھے اُسکے ستارے پھرتے
سر پرست اُن کا زمانے میں نہیں کوئی رہا
حال باقی نہیں کچھ اُن کا فسانے میں رہا

اس برس پرورشِ عام جو مبذول ہوئی — واسطے اُن کے بھی تدبیر ہے معقول ہوئی

ہوئی مقبول زمانہ میں جو یہ خوشخبری — گھر بہ گھر دل کی امیدوں نے ہے کی جلوہ گری
کہیں ساماں ہے کہیں بے سر و ساماں خوش ہیں — یہ خوشی وہ ہے کہ ہندو و مسلماں خوش ہیں

رات درگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں — دن کو پھرتے ہیں تو شکر اپنے ادا کرتے ہیں
ان میں ہے بندۂ آزاد یہ کہتا بہ نیاز — حضرتِ قیصرۃ الہند کی ہو عمر دراز
اُن کے فرزند سدا خرّم و دلشاد رہیں — اُن کی اولاد سے آبادیاں آباد رہیں
جاری اِس جشنِ مبارک کا سدا دَور رہے
روشِ گردشِ دولاب یہی طور رہے

ایک تارے کا عاشق

اک سخنور کسی تارے کا تماشائی تھا — اُس کے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
دل سے وہ چاند کا ٹکڑا اُسے بھایا ہوا تھا — اور وہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہوا تھا
وہ ستارا کہ ہوا آنکھوں کا تارا تھا اُسے — چشمِ حیرت میں نظارے کا سہارا تھا اُسے
اوجِ معنی سے مضامیں تھا اُتارا کرتا — اور انہیں اپنے ستارے پہ تھا وارا کرتا
چشمِ حیرت سے نظر اُس پہ سدا کرتا تھا — دل کے سب راز و نیاز اُس سے ادا کرتا تھا
غم جو اک شب اُسے بے تاب و تواں کرنے لگا — مُنہ ہی مُنہ میں یہ سخن اُس سے بیاں کرنے لگا
ہے تو تو نورِ شبِ تیرہ، غیرتِ صد حور ہے تو — مگر اس عاشقِ دلدادہ سے کیوں دور ہے تو

منہ ترا مہر صفت سے گا دمکتا پیارے — سرد مہری سے مگر کیوں ہے چھپکتا پیارے
اے وہ تو جس پہ کہ قابو کسی کوئی بات نہیں — چشم حسرت کے سوا حرف حکایات نہیں
ہیں جو ارمان بھرے دل میں نکالوں کیونکر فلک ہائے چھاتی سے تجھے اپنے لگاؤں کیونکر
دم نکل جائے تو ہو یار مبارک مرنا — یوں ہو مرنا تو ہو سو بار مبارک مرنا
اپنے تارے کو جو حسرت سے تکتا تھا پڑا — جام دل جوش محبت سے چھلکتا تھا پڑا
آ و مینا اُسے تب اُسکے خیالات نے دی — دفعتہً جنبش ادھر شوق ملاقات نے دی
بن کے عورت کشش عشق کی ماری آئی — آسماں چھوڑ زمیں پر وہ بچاری آئی
یہ تو بتلا کسی عورت کی ہے چھاتی اچھی — یا کرن تارے کی شب کو نظر آتی اچھی
سنتی شاعر نے جو یہ بات تو شرمایا بہت — بلکہ شرمایا نہیں جتنا کہ پچھتایا بہت
بولا افسوس وہ تارا جو اُڑاتا تھا مجھے — اوج افلاک پہ کھینچے لئے جاتا تھا مجھے
آج وہ نور فلک ہاتھ سے کھویا میں نے — بولی وہ اپنا بھی کام آج ڈبویا میں نے

تو نے گردوں پہ چمکتا ہوا تارا کھویا
میں نے ہاں عاشقِ شیدا اسحٰق آرا کھویا

محنت کرو

ہے امتحاں سر پہ کھڑا محنت کرو محنت کرو — باندھو کمر بیٹھے ہو کیا محنت کرو محنت کرو
بیشک پڑھائی ہے سوا اور وقت ہے تھوڑا رہا — ہے ایسی مشکل بات کیا محنت کرو محنت کرو
شکوے شکایت جو کہ تھے۔ تم نے کیے بیٹھے — جو کچھ ہوا اچھا ہوا محنت کرو محنت کرو
محنت کرو انعام لو انعام پر اکرام لو — جو چاہو گے مل جائیگا۔ محنت کرو محنت کرو
جو بیٹھ جائیں ہار کر۔ کہدو انہیں للکار کر — ہمت کا کوڑا مار کر۔ محنت کرو محنت کرو

ہم بولی پھر اُس سے کرا سے شاعر شیدا میرے — شوقِ دیدار ہے دل میں تیرے کیا کیا میرے
گرشتہ شوق سے [illegible] مجھے [illegible] — تو وہ عاشق سے کہ آخر کو مجھے

تدبیریں ساری کہہ چکے ۔ باتوں کے دریا بہہ چکے
بک بک سے اب کیا فائدہ محنت کرو محنت کرو

پہنچ اگر ڈالو گے تم ۔ دل سے اُسے پالو گے تم
دیکھو گے پھر اسکا مزا ۔ محنت کرو محنت کرو

محنت پہ کی جی توڑ کر ۔ ہر شوق سے مُنہ موڑ کر
کر دو گے دم میں فیصلہ ۔ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہو یا سوداگری ۔ ہو بھیک یا ہو چاکری
سب کا سبق یکساں سُنا ۔ محنت کرو محنت کرو

جس دن بڑے تم ہو گئے ۔ دُنیا کے دھندوں میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کہاں ۔ محنت کرو محنت کرو

بچپن رہا کس کا سدا ۔ انجام کو سوچو ذرا
یہ تو کہو سکھاؤ گے کیا ۔ محنت کرو محنت کرو

نو طرزِ مرصّع

اقبال اک برس جو مرا تاجِ سر ہوا
شملہ پہ مجھ کو موسم سرما بسر ہوا

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو بہے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحافِ ابر میں مُنہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سپید
باہر چلو تو دامنِ کہسار تھے سفید

پتے بھی آ کے جاڑے نے سب دور کر دئے
اور تھے درخت برف نے بلور کر دئے

اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا

دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں
ہمت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے سپہ نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!

ہمت کا اُسکی حال میں لکھ کر سناؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا

جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
پیدا شکوہ و شان تھی اُس کے نشان سے

چلتا قدم اُٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا

کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا — تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا — لیکن خموشی اُس کی یہ آواز کرتا
دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا — دامن تھا اُس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آکے خود سیاہیِ شب راہ پر پڑی — آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی — باتیں کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سرِ دیوار سامنے — دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کے ساماں پکارتے — تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ تھک گئے نہ جا نہ جا — اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ ہیچ ہیچ بجا بجا
سمجھانے والے سب یونہی سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے
چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو!

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے — اک پیر مردِ تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دبا — موئے سپید نے ندی پیرہن دبا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے — اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں — چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتیں بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا — ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
مانا کہ لطفِ عیش و طرب پر نظر نہیں — جاتا کہاں ہے موت کا بھی تجھکو ڈر نہیں
یہ سُن کے نکلا شعلہ دلِ نوجوان سے — گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اُس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو!

تھی رات رنگ ابھی رُخِ عالم پہ پھیرتی — گہ مشک اُڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی
کیا جانے ہم نکل کے کدھر سے کدھر گئے — دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اُتر گئے

موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی   خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آوازیں دے رہے   مل جل کے ساتھ جیسے ہوں دمساز رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں   جو زیر و بم کی دور سے ہیں سُر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے   کی رمزِ گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے   آرام کیجے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے مگر چشمِ ناز سے   اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے
پھر اتنا مُسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو!

تنگ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا   لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
مُنہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا   گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی   چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں   اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا   اور جھوم جھوم کر وہ رُخِ گل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی   شبنم تھی آ کے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے چلتے تھے   پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے چلتے تھے
سُورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر   بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر
آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں بڑھے چلو!

تبدیل جبکہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا   اک مدرسے کے آگے سے اسکا گذر ہوا
تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا   مُلا تھا اُس میں بر سرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا   اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حُور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا   دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اُسکی باتوں پہ مدہوش ہو رہے   اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے

دیکھا جو نوجوان کو اس مردِ پیر نے — اپنی لکیر پیٹی پرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم — بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ زمانے گزر گئے — وہ رات ہو چکی وہ فسانے گزر گئے
اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو!

ملک فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے — بے پاؤں بے مدار ہے جو اس کی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ — ہمت کے معرکوں کے لئے خوب جا ہے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے — مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض — ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانہ ہے — افلاس ان کے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت سے کام ہیں — محنت سے پیٹ پالتے صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے — تنخواہوں پر ہیں محنتیں استاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام — کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام
آزاد کی یہی ہے صدا ہاں بڑھے چلو!

نظم اردو

۸ مئی سنہ ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں عمدہ یادگار سمجھا جائیگا۔ نظم مذکور کی آگ ایک چقماق سے نکلی تھی جس کا ایک پرزہ شعرائے آتش بیان کی طرح روشن تھی۔ دوسرا پرزہ امرائے زندہ دل کی گرم

طبیعت۔ ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدہ کو ولادت دی۔ اور دوسرے کی قدردانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔ مخلوق مذکور اُسی حال میں بڑھیا ہو کر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی معمولی مضمون تھے جو پہلے اُستادوں نے نکالے تھے موجودہ شاعر چبائے ہوئے نوالوں کی طرح انہیں لیتے تھے۔ الفاظ اُدل بدل کرتے تھے۔ اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے سال مذکور میں میرے اُستاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ اُنہوں نے اس مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا۔ اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ اہلِ علم۔ اہلِ ذوق جمع ہوئے۔ نثر اور نظم مذکور پڑھی گئی۔ اور سب نے صلاح کر کے ایک مشاعرہ قائم کیا۔ کہ شعرا ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ ۱۱ مہینے تک مشاعرہ قائم رہا۔ اس وقت نظم مذکور کی شروع پر لوگوں نے کچھ کچھ مخالفت کی۔ مگر ۱۲ برس کے عرصہ میں اتنا اثر ہوا کہ اب ہندوستان کے مشہور شہروں سے ویسی ہی نظموں کی آوازیں آتی ہیں۔ لکچر اور مثنوی مذکور اب نہیں ملتی۔ اور لوگ طلبگار رہیں۔ چونکہ یہ تاریخی مطلب ہے۔ اس کے حرفوں کو مٹنے دینا نہیں چاہیئے۔ اس لئے اس کتاب میں لکچر مذکور کا درج کرنا مصلحت ہے تاکہ نئی نسل کے خیالات میں وسعت پیدا کرے ۔ (راقم [illegible] نگار شاگرد حضرت آزاد مرحوم)

(صفحہ ۱۰ کا پیراگراف) جب بھاشا سے اُردو پیدا ہوئی تو کئی سو برس تک اُس میں باتیں ہی باتیں رہیں یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ پریشان شعر تو کئی سو برس سے اُردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہجہان کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی تو ولی شاعر پیدا ہوئے اور ساتھ ہی جا بجا دیوان ترتیب ہونے لگے ۔